اکادمی ادبیات پاکستان
پاکستانی ادب کے معمار
انیس ناگی: شخصیت اور فن
ڈاکٹر شاہین مفتی

پاکستانی ادب کے معمار

انیس ناگی
شخصیت اور فن

ڈاکٹر شاہین مفتی

اکادمی ادبیات پاکستان

نگرانِ اعلیٰ	فخر زمان
تدوین و طباعت	سعید درانی
سکیچ	تنویر حیدر
اشاعت	2009
تعداد	500
ناشر	اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد
مطبع	گل اعوان پرنٹرز، اسلام آباد
قیمت	مجلد: -/250 روپے
	غیر مجلد: -/230 روپے

ISBN: 978-969-472-207-8

Pakistani Adab Ke Mamar

"Anees Nagi : Shakhseyat our Fun"

Compiled By

DR.Shaheen Mufti

Publisher

Pakistan Academy of Letters

Islamabad,Pakistan

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

فہرست

پیش نامہ

پاکستانی زبانوں میں ہمارے مشاہیر نے پاکستانی ادب کے حوالے سے جو کام کیا ہے کسی بھی بین الاقوامی ادب کے مقابلے میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ اکادمی ادبیات پاکستان نے ان مشاہیر کے علمی وادبی کام اور اُن کی حیات کے بارے میں معلومات کو کتابی صورت میں لانے کے لیے پاکستانی ادب کے معمار کے نام سے اشاعتی منصوبہ شروع کیا ہے جس کے تحت پاکستانی زبانوں کے مشاہیر پر کتابیں شائع کی جارہی ہیں۔

انیس ناگی ایک ہمہ جہت ادیب ہیں۔ بہت کم ادیبوں نے ادب کی اتنی ایک سی اصناف میں ایک ساتھ اپنے فن کے جادو جگائے ہیں۔ ناول، شاعری، افسانہ، تنقید، ترجمہ، ادبی وثقافتی تاریخ، تحقیق اور صحافت ان تمام میدانوں میں نئی بات کہنے کی صورت میں انیس ناگی گزشتہ چالیس برسوں سے دنیائے ادب کو روشن کیے ہوئے ہیں۔

اسی اشاعتی منصوبے کی ایک کتاب ''انیس ناگی: شخصیت اور فن'' اکادمی ادبیات پاکستان کی درخواست پر معروف ادیبہ وشاعرہ ڈاکٹر شاہین مفتی صاحبہ نے تالیف کی ہے۔ اس کتاب سے یقیناً اہل ادب اور عام قاری انیس ناگی کی فن وشخصیت سے بہتر طور پر آگاہ ہوسکیں گے۔

یہ کتاب انیس ناگی کے بارے میں ایک اہم دستاویز کی حیثیت کی حامل ہوگی۔ امید ہے کہ اکادمی ادبیات پاکستان کے اشاعتی منصوبے ''پاکستانی ادب کے معمار'' کی کتاب ''انیس ناگی: شخصیت اور فن'' کو ملک اور بیرون ملک یقیناً پسند کیا جائے گا۔

فخر زمان

پیش لفظ

نصف صدی سے اردو ادب کی دنیا میں انیس ناگی انکار کی سلطنت کے شہنشاہ کی حیثیت سے اپنی جداگانہ شناخت بنا چکے ہیں، ان کا ادبی محاذ بہت کشادہ ہے، ان کی ہشت پہلو تخلیقیت بیک نظریہ سازی اور نظریاتی انہدام کے ان گنت تجربے کرتی چلی گئی ہے، لسانیات، نفسیات، ثقافت، تاریخ، مذہب، معیشت اور عمرانیات کے ساتھ ساتھ عصری ادب کے مستقل مطالعے نے ان کی تحریروں کو زمان و مکاں کے تسلسل میں اس طرح پرودیا ہے کہ مصنف اور اس کے موضوعات نفی و اثبات کا گنگا جمنی منظر نامہ بن گئے ہیں۔

فی زمانہ جب ساختیات والے تحریر کی موجودگی کو مصنف کی موت قرار دے رہے ہیں، انیس ناگی کی جملہ تحریریں شعور کی رو کے دائرے سے نکل کر ایک تاریخی تسلسل کا حصہ بن گئی ہیں، یہاں مصنف کی موجودگی اس کی سوانح، اس کے ماحول، اس کے مطالعے، اس کے عصری شعور اور اس کے توہمات و اشتباہات کی موجودگی میں ڈھل گئی ہے اور مصنف کا لفظی انتخاب معنی کے لاشعوری نظام کا تسلسل بنتا چلا گیا ہے۔

یقیناً دانش ور وہی ہوتا ہے جو تصورات اور صورتِ حال تخلیق کرتا ہے، جو پرانے تجربے کو نئے استفسارات کی رفاقت عطا کرتا ہے، جو طبقاتی غیر جانبداری اور عصری حساسیت کے امتزاج سے نئے حقائق اور واقعات کی پرداخت کا بیڑا اٹھاتا ہے اور پھر اس کا مضطرب وجود اپنی لامتناہی تنہائی کو اپنے مقاصد کی طاقت عطا کرتے ہوئے اس جدلیاتی ادب کا راستہ طے کرتا ہے جہاں مستحکم دانش منافقت کے ہر منظر پر خطِ تنسیخ پھیرتی چلی جاتی ہے۔

1960ء کی دہائی میں نئی شاعری ایک ابتلاء کی وارد ہوئی، تجربہ کرنے کے شوق میں سینکڑوں لکھنے والے اس راستے سے بیگانہ وار گذرے لیکن انیس ناگی اس نئی شاعری، نئی فکشن نگاری اور نئی تنقید کے تشکیلی نظام کے ساتھ آہستہ آہستہ لائٹ ہاؤس کی صورت اختیار کرتے چلے گئے اور عہد بہ عہد تغیرات میں ان کی ذہنی کا کردگی عصری الہام کے درجے پر جا پہنچا۔ تاریخ اور نظریات کی کساد بازاری میں ''دیوار کے پیچھے'' کا آدمی آج ''313 بریگیڈ'' کی دہشت گردی کا شکار ہے، ''بشارت کی رات'' بیگانگی کے موسم میں تبدیل ہوئی ہے۔ آدرشی ادیب کی سرنوشت میں ''محاصرہ'' اور ''زوال'' لکھا گیا ہے لیکن اس کے باوجود وہ انفرادی آزادی کو گروہی آزادی میں تبدیل کرنے کے خواب سے دست کش نہیں ہوا، اس کا کہنا ہے کہ کلچر میں تبدیلی روزمرہ کی زندگی کی ضروریات تبدیل کرتی ہے، پرانی روایت کے خوف نے ہمارے لکھنے والوں کو پابہ زنجیر رکھا ہے ضروری ہے کہ ہم مقبولیت کی شدید خواہش اور تنقید کے خوف سے رہا ہو کر اجتہاد کا راستہ اختیار کریں ورنہ ہماری زندگی بے معنی ہو جائے گی، تخلیقی سطح پر زندہ رہنے کے لئے ذاتی صورت حال کی دریافت کیا معنی رکھتی ہے اس کا بھید آپ کو انیس ناگی کی عمرانیاتی اور نفسیاتی تحریروں میں ملے گا۔

آنے والے صفحات میں کوشش کی گئی ہے کہ انیس ناگی اور ان کی تحریروں کو بین الاقوامی تناظر میں رکھ کر فرد اور گروہی نظام کے اشتراک اور جبر و اختیار کے معاملات پر روشنی ڈالی جائے اگر آپ بھی اس عصری افق پر کچھ دیر ٹھہریں تو یقیناً یگانگت کے تجربے سے آشنائی حاصل کریں گے، میں عفت انیس کی شکر گذار ہوں جنہوں نے کچھ مقامات پر میری راہنمائی کی۔

میں اکیڈمی ادبیاتِ پاکستان کے گذشتہ چیئرمین جناب افتخار عارف اور موجودہ چیئرمین محترم فخر زمان کی مشکور ہوں جنہوں نے انیس ناگی جیسے ہمہ جہت دانش ور کی شخصیت و فن کو اس مختصر کتاب میں اکٹھا کرنے کا موقع فراہم کیا۔ میں محترمہ سعیدہ درانی کے تعاون کی بھی احسان مند ہوں۔

شاهین مفتی

میری سرگذشت

میری بیاض میں لہو کا رنگ ہے

میری بیاض انتشار عہد ہے

ذات کا زوال ہے

اپنی ہی سرزمین میں گمانشتے مری تلاش میں رہے

کہ میرا لفظ اختلاف ہی کا لفظ تھا

جسے نہ وہ سمجھ سکے

کیا کہوں میری بیاض میں نہ اس ہے (میری ادبی بیاض، ص 54-55)

انیس ناگی نے 11 فروری 1939* بروز جمعہ بقر عید شیخو پورہ ضلع لاہور میں جنم لیا، اپنے پیدائش کے دن سے متعلق وہ ایک مفروضہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ 1

''دونوں نیک دن ہیں لیکن کہا جاتا ہے کہ ان دونوں مبارک دنوں کا یک جا ہونا درست نہیں، جو اس دن بادشاہ بنے یا جنم لے اس کا مقدر زوال ہوتا ہے۔ میں بادشاہوں کے بارے میں تو نہیں جانتا لیکن اپنے بارے میں پتہ ہے کہ میں نے نہایت مشکل زندگی گزاری ہے جس میں راحت اور خوش قسمتی کا دور دور تک نشان نہیں ملا، اس لئے میں اپنی سرگزشت کو زوال کی کہانی کہوں گا۔''

انیس ناگی کے آباؤ اجداد امرتسر کے رہنے والے تھے جہاں ہاتھی دروازے کے اندر ایک محلے رُوبا گھ سنگھ میں ایک بڑا موروثی مکان ان کے اجداد نے تعمیر کیا اور چھوٹا مکان از اں بعد والد

* سرکاری کاغذوں میں تاریخ پیدائش 1940 لکھی گئی ہے۔

نے ملازمت کے دوران خریدا، یہ خاندان ہندوؤں سے مسلمان ہوا تھا، انیس ناگی کے اجداد پنڈت تھے اور امرتسر کے مضافات میں ان کے ایک بزرگ پروہت شاہ اسماعیل شہید کے ہاتھوں مسلمان ہوئے، انیس ناگی کے والد کا پورا نام مولوی محمد ابراہیم تھا۔

''میں نے جب پہلی مرتبہ اپنے والد کو دیکھا تو ان کے چہرے پر عمر کی لکیریں نمودار ہو چکی تھیں، ان کی فرنچ کٹ داڑھی سفید تھی، وہ خوش شکل اور وجیہہ تھے، سبز رنگ کی غلافی آنکھیں پیچھے کو ہٹتا ہوا کشادہ ماتھا، لمبا قد اور مضبوط بدن، ان کی شکل فرائیڈ اور جارج پنجم سے ملتی جلتی تھی، یہ وہ زمانہ تھا جب شاذ و نادر ہی مسلمان سروسز میں آیا کرتے کیونکہ ہندوؤں نے ہر سطح پر مسلمانوں کا ناطقہ بند کیا ہوا تھا، وہ بڑے فخر سے کہا کرتے کہ میں پنجاب میں پہلا مسلمان ہوں جس نے مقابلے کے امتحان کے بعد یہ ملازمت حاصل کی۔ یہی احساسِ تفاخر عمر بھر ان کے ساتھ رہا۔''

(ایک ادھوری سرگذشت، ص16)

مولوی محمد ابراہیم مسلک کے اعتبار سے وہابی تھے، ان کا زیادہ اصرار راست روی پر تھا؛ وہ مذہب کو عقلی نقطہ نظر سے دیکھنے کا رجحان رکھتے تھے، دنیاداری کے ساتھ ساتھ انہیں قرآن کی تلاوت اور مذہبی کتابوں کے مطالعے کا شغف تھا۔ انہوں نے ایک چھوٹا سا کتابچہ ''قرآن کیوں اترا'' اور ایک پمفلٹ حجر اسود شائع کروا کر لائل پور میں تقسیم کیا۔ مولوی محمد ابراہیم کو ہندوؤں کے مقدس پودے تلسی سے بھی خاص دلچسپی تھی، ایک عمر میں وہ پیری فقیری کی جانب بھی مائل رہے اور دم درود سے خلقِ خدا کو فیض پہنچانے کی کوشش کی، مولوی ابراہیم نے تین شادیاں کیں، انیس ناگی کی والدہ سارہ بیگم ان کی تیسری بیوی تھیں، بقول مصنف

''اپنے بزرگوں کی زندگی کے واقعات اور خود اپنے والد کے بعض رویوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ عورت کو پرکاہ کی وقعت نہیں دیتے تھے، وہ ہر بات میں اپنی من مانی کرتے، وہ بیویوں اور عورتوں کو مردوں کی خدمت گذار سمجھتے۔ عورت کے حق میں سب سے پہلے بغاوت میری بہنوں نے کی لیکن یہ بہت بعد کا زمانہ ہے۔''

مولوی محمد ابراہیم دورانِ ملازمت جوڈیشل آفیسر کی حیثیت سے مختلف مقامات پر ملازمت کرتے رہے، آخری عمر لاہور میں بسر کی، کچھ عرصہ ایک کمپنی کے قانونی مشیر بھی رہے۔

''والد کے انتقال کے بعد ہمارے گھر میں سب کچھ درہم برہم ہو گیا۔ اس کے باوجود ہر کوئی اپنے آپ کو آزاد محسوس کرتا تھا۔۔۔ ہر کوئی جو چاہے کر سکتا تھا لیکن کوئی کیا کرنا چاہتا تھا یہ ایک سوالیہ نشان تھا۔''

انیس ناگی کی والدہ ایک سیدھی سادھی ناخواندہ عورت تھیں جو عمر میں اپنے شوہر سے کافی چھوٹی تھیں، انہوں نے نہایت صبر اور اطاعت کے ساتھ زندگی بسر کی، وہ تین سوتیلے بیٹوں اور دو سوتیلی بیٹیوں کی موجودگی میں ہمیشہ اپنی اولاد کے لئے بھی ایک سوال ہی رہیں۔

''میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ میری ماں نے ایسی جگہ شادی کرنا کیوں قبول کیا جہاں اسے انصاف نہیں مل سکتا تھا۔''

انیس ناگی کی سرگذشت میں ان کے پانچ بہن بھائیوں کا سرسری تذکرہ ملتا ہے اتفاق کی بات ہے کہ گھر میں اتنی آبادی کے باوجود انیس ناگی سب سے الگ تھلگ رہتے تھے، ان کا زیادہ وقت اپنے سے بڑے بھائی کے ساتھ بسر ہوا لیکن اس کے باوجود ان کے درمیان کوئی رشتۂ یگانگت نہ بن سکا۔

''زندگی اختیار کرنا بہت مشکل ہوتا ہے کیونکہ زندگی کا چلن معاشرہ فرد پر نافذ کرتا ہے، کوئی اس کی حاکمیت کس حد تک قبول کرتا ہے اسی سے ہر فرد کی کہانی مرتب ہوتی ہے۔''

انیس ناگی کا بچپن پانچ چھ شہروں میں بکھرا ہوا ہے، ان کی یادداشت کا عمل سیالکوٹ شہر سے شروع ہوتا ہے ابھی وہ سکول جانے کے قابل نہیں تھے اس لئے سارا وقت گھر میں گذرتا اور ماں اپنی مصروفیات کی وجہ سے ان سے لاتعلق سی رہتی، زیادہ وقت ملازموں میں بسر ہوتا، یہیں انہوں نے زندگی کی پہلی فلم دیکھی۔

روہتک میں ان کی تعلیم کا باقاعدہ آغاز ہوا اور انہیں بڑی بہن کے ساتھ لڑکیوں کے سکول میں

داخل کرادیا گیا، اسی شہر میں پہلی مرتبہ شکار کیے گئے ہرن کا گوشت کھاتے ہوئے انیس ناگی احتلام کا شکار ہوئے۔

''میں آج بھی اس تصور پر قائم ہوں کہ انسان ایک گوشت خور درندہ ہے جس کی تمام جبلتوں کو کوئی نظریہ Tame نہیں کر سکتا۔'' روہتک سے تبادلے کے بعد یہ خاندان لائل پور پہنچا۔ جہاں مولوی محمد ابراہیم نے لڑکوں کی تعلیم کے لئے اتالیق کا بندوبست کیا۔

بقول انیس ناگی

''امرتسر، روہتک، لائل پور، لدھیانہ سب میرے لئے ایک ہی شہر تھے۔ ان شہروں نے میرے اندر تحیر کو جنم نہیں دیا تھا۔ میں جس خانگی آب و ہوا میں پرورش پا رہا تھا وہ نہایت سپاٹ اور بے کیف تھی۔'' (ص 37)

شاید ہم ایک دوسرے کی زندگی بسر کرتے ہوئے اپنی زندگی سے محروم ہو جاتے ہیں، لائل پور میں ایک انگریز جوڑا جو ادھیڑ عمر تھا اور بے اولاد بھی انیس کو گود لینا چاہتا تھا، یہ انگریز سیشن جج مولوی ابراہیم کا افسر تھا۔ یہ معاملہ انیس ناگی کی والدہ کی خاموشی سے ٹل گیا۔ جب انیس ناگی پانچ برس کے ہوئے تو انہیں لدھیانہ کے اسلامیہ سکول میں داخل کرا دیا گیا، اسی اثنا میں ہندوستان کی تقسیم کی تحریک جڑ پکڑنے لگی اور فضا اس قسم کے نعروں سے گونجنے لگی۔

''پاکستان مردہ باد...... جو مانگے گا پاکستان اسکو ملے گا قبرستان'' کچھ عرصہ بعد مولوی محمد ابراہیم کا تبادلہ جالندھر ہو گیا، جہاں سول لائن کا علاقہ شہر سے بہت دور تھا، یہاں بھی پہلے اتالیق سے تعلیم کا بندوبست کیا گیا اور پھر گورنمنٹ ہائی سکول جالندھر میں داخل کرا دیا گیا۔ جہاں ہندو ماسٹر انیس ناگی کو طرح طرح سے تنگ کرنے لگے، یہیں استاد کی باپ سے شکایت کر کے بعد ازاں مکر جانے کے باعث انیس ناگی نے محسوس کیا کہ وہ اندر سے کافی بزدل ہیں اور ذرا سی مشکل صورت حال سے پریشان ہو جاتے ہیں۔ جوں جوں عمر بڑھتی گئی پیہم پریشانی ان کی ذات کا حصہ بنتی گئی، جالندھر میں پہلی مرتبہ انیس ناگی نے شاہنامہ اسلام کے خالق حفیظ جالندھری کو اپنے گھر میں دیکھا نئے تبادلے کے سلسلے میں کچھ عرصہ امرتسر میں قیام کے بعد یہ خاندان لاہور

میں رہائش پذیر ہوا کہ باقی زندگی پاکستان میں بسر کرنے کا فیصلہ کیا۔ شاید مولوی صاحب امرتسر نہ چھوڑتے لیکن ہندو، سکھ اور مسلمان ایک دوسرے کی گھات میں تھے۔ ہر طرف خوف و ہراس اور بے اعتمادی کا عالم تھا۔ امرتسر تیزی سے خالی ہو رہا تھا۔ یہ بات شہر میں پھیل گئی کہ کٹڑا بھاگ سنگھ اور ہاتھی دروازے کے مسلمان مکان خالی کر رہے ہیں، ادھر لوگ اسٹیشن تک پہنچے ادھر حملہ آور آن وارد ہوئے۔ فوجیوں کی موجودگی میں لوگوں کی جانیں بچ گئی۔ انیس ناگی کے لئے لاہور ایک بالکل نیا شہر تھا جہاں ان کی دو سوتیلی بہنیں پہلے سے رہ رہی تھیں، سب سے بڑی بہن کے گھر ٹھہرنے کا فیصلہ ہوا۔ یہ مکان چڑیا گھر کے قریب تھا، رات کے وقت شیر دھاڑتا تو دہشت سے نیند اڑ جاتی، کچھ تگ و دو کے بعد محکمہ بحالیات نے ٹیپ روڈ پر انہیں ایک کوٹھی الاٹ کر دی یہ کوٹھی گھوڑا ہسپتال کے قریب تھی، مولوی ابراہیم نے امرتسر کی املاک کے بدلے دیوی دیال چنڈھوک کی کوٹھی حاصل کی اور ازاں بعد اپنی تمام اولاد کے نام شرعی حصوں کے مطابق تقسیم کر دی اور ایک کلیم اپنے ایک سوتیلے بیٹے کے نام سے حاصل کیا۔ یہی گھر ازاں بعد تنازعے کا باعث بنا۔ امرتسر کے گھر جل کر کوئلہ ہو گئے۔

> ''والدہ کی موجودگی میں گھر کے تمام افراد کی حیثیت صفر کے برابر تھی جو شخص کسی گھر کی کفالت کرتا ہے وہی حکمران ہوتا ہے''۔ (ص 81)

اسی اثنا میں ان کا تبادلہ میانوالی ہو گیا جہاں جاگیرداری نظام کے ساتھ ان کا نباہ نہ ہو سکا اور نواب ان کا دشمن بن گیا اور ان کو جان کے لالے پڑ گئے، اس لمحے سے مولوی ابراہیم کا زوال شروع ہوا۔ انیس ناگی کا تعلیمی سفر کسی منصوبہ بندی کا نتیجہ نہیں تھا۔ ان کے والدین اپنی دنیا میں مگن تھے، والد کے پے بہ پے تبادلوں سے ان کا معصوم ذہن کئی طرح کی پریشانیوں کا شکار ہوا۔

> ''اگر میرے والد مہربان ہوتے تو میں شاید ان کے سائے کی انگلی پکڑ لیتا لیکن میں تو دائمی طور پر خوف و ہراس میں رہتا تھا ان کا نام ابراہیم تھا اور ان حالات میں میں اسماعیل کیسے بن سکتا تھا''؟

پاکستان بننے کے بعد لاہور کے سب سے نامور سکول میں داخل کرایا گیا جسے سنٹرل ماڈل

سکول کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ والد کا تبادلہ ڈیرہ غازی خان ہوا تو انیس ناگی کو اسی قصباتی شہر کے گورنمنٹ سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ یہیں انہوں نے پہلی بار پروفیسر جیلانی کامران کو دیکھا جو گورنمنٹ کالج میں ان کے بڑے بھائی کے پروفیسر تھے، اس شہر میں انیس ناگی ایک برس رہے اور یہیں انہوں نے اپنے اور اپنے اردگرد کی چیزوں کے بارے میں سوچنا شروع کیا اور ہر بات میں سے کوئی نہ کوئی مطلب نکالنے کی کوشش کا آغاز کیا، ازاں بعد والد کی تعیناتی لاہور ہوگئی دو تین برس کے بعد والد کی ملازمت ختم ہوگئی اور زندگی کا ایک اور دور شروع ہوا، لاہور واپسی پر سنٹرل ماڈل سکول کی بجائے انہیں قادیانیوں کے ایک سکول میں داخل کرایا گیا، یہاں کے لفنگے لڑکوں سے انہیں دلچسپی پیدا نہ ہوسکی البتہ سکاؤٹنگ کا شوق پیدا ہوا، اسی اثنا میں انہوں نے تیراکی سیکھی، میٹرک پاس کرنے کے بعد وہ اپنے دوسرے بھائیوں کی طرح گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے، ان کے پرنسپل کا نام قاضی محمد اسلم تھا۔ جو امرتسر کے رہنے والے تھے اور ان کے والد کے دوست تھے۔ یہاں زاہد ڈار، آغا علی اور سردار مظہر علی خان سے دوستی ہوگئی، زاہد ڈار کمیونسٹ پارٹی سے منسلک تھا چنانچہ اسی تعلق داری میں سی آئی ڈی ان دوستوں پر نظر رکھنے لگی، زاہد ڈار ازاں بعد بغیر ویزے اپنے شہر لدھیانے چلا گیا، لاہور واپسی پر پولیس نے بارڈر پر پکڑ لیا۔

انیس ناگی کا زمانہ طالب علمی دو حصوں میں تقسیم رہا، پہلا حصہ ایک سپورٹس مین کا تھا کیونکہ ان کے چاروں بھائی اچھے تیراک تھے اور کالج کی واٹر پولو ٹیم میں شامل تھے۔ انیس ناگی کو تیراکی کے علاوہ جمناسٹک اور تن سازی کا بھی شوق رہا، وہ ویٹ لفٹنگ کی ٹریننگ بھی کرتے رہے ایک بار مسعود کھدر پوش سے رسٹ ریسلنگ میں فتح حاصل کی۔ کتابیں پڑھنے کا شوق بھی ساتھ ساتھ رہا، بی۔اے میں مزاج میں مزید تبدیلی آئی، سپورٹس اور پڑھائی سے طبیعت اچاٹ ہوئی شعر و ادب کے مطالعے کا جنون ہوا، وہ کلاسز سے غیر حاضر رہنے لگے، کہیں دل نہ لگتا، بارش کے موسم میں چپکے سے گھر سے نکلتے اور بھیگتے ہوئے سڑکوں پر چلتے رہتے، اسی اثنا میں سگریٹ نوشی کی عادت راسخ ہوئی۔
والد ریٹائرمنٹ کے بعد راجندر سنگھ بیدی، غلام عباس اور کرشن چندر کی کتابوں سے دل

بہلاتے تو انیس ناگی بھی ان کتابوں کو پڑھتے اور بحث مباحثہ کرتے ، سعادت حسن منٹو کے تذکرے پر والد کی ناراضگی بھی گوارا کرنی پڑتی۔

کالج کے زمانے میں روسی تحریروں کے ساتھ ساتھ فرانسیسی ادب کا مطالعہ کیا، اسی زمانے میں ناولوں کے نسائی کردار ان کی چشم تصور سے نکل کر انہیں دن کے سپنوں میں مبتلا کرنے لگے، کالج میں وہ ادبی میگزین ''راوی'' کے مدیر بن گئے اور انہیں کالج کی ادبی انجمن ''مجلسِ اقبال'' کا بھی سیکرٹری بنادیا گیا یہ سب کچھ ڈاکٹر نذیر احمد پرنسپل گورنمنٹ کالج کی حوصلہ افزائی کا نتیجہ تھا۔

اسی زمانے میں قیوم نظر جو پاک ٹی ہاؤس اور حلقہ ارباب ذوق کے بے تاج بادشاہ بنے ہوئے تھے اور اپنے آپ کو میرا جی کے قریبی ساتھیوں میں شمار ہوتے تھے انہوں نے انیس ناگی کی نئی شاعری اور جارحانہ تنقید کا اس طرح نوٹس لیا کہ نئے شعراء کو حلقہ ارباب ذوق کی بساط سے اٹھانے کے لئے گورنمنٹ کالج میں منٹو اور پروفیسر جی۔ ایم اثر کی کہانیوں کو مبالغہ آمیز طریقے سے مشتہر کرتے ہوئے انیس ناگی اور دوسرے طلبا کو حکومت دشمن قرار دیا گیا۔

کالج کی زندگی کے دوران ہی انیس ناگی کی ملاقات محمد صفدر میر سے ہوئی جو اردو کے بہت اچھے شاعر تھے اور نئی اردو شاعری کے پیش روؤں میں سے ایک، وہ گورنمنٹ کالج میں انگریزی کے استاد تھے اور کالج کی ٹک شاپ میں لڑکوں کے ہجوم کے ساتھ بیٹھے شعر و شاعری، ڈرامہ، سیاست اور ہر طرح کے موضوعات پر لیکچر دیتے، کالج انتظامیہ کا خیال تھا کہ وہ طالب علموں کو گمراہ کرتے ہیں، انیس ناگی، افتخار جالب اور سلیم الرحمٰن ان کے چنگل میں آئے اور آہستہ آہستہ صفدر میر سے انارکلی کے ایک ہوٹل میں ملاقات کے لئے آنا جانا شروع ہوا۔ میر صاحب ایک غیر متوازن، بے حد ضدی اور جلد مشتعل ہو جانے والے انسان تھے وہ طرح طرح کے منصوبے بناتے رہتے کبھی انقلاب لانے کے کبھی پنجابی زبان کے فروغ کے۔ سرکاری ملازمت کے باوجود خفیہ پولیس ان کے تعاقب میں رہتی۔ انہوں نے پنجابی مجلس بنائی اور انیس ناگی کو اس کا سیکرٹری بنادیا۔ موری دروازے کے باہر ایک میونسپل لائبریری میں اس پنجابی مجلس کے ہفتہ وار اجلاس ہونے لگے ایک مرتبہ صفدر میر اس مجلس کا الیکشن ہار گئے اور نوجوانوں کو سی آئی

ڈی کا ایجنٹ قرار دے دیا، کچھ عرصہ بعد حکومت پنجاب نے پنجابی مجلس کو بائیں بازو کی انجمن قرار دے کر Ban کر دیا۔ میر صاحب نئے شعراء کے خلاف ہوئے اور کالم نگاری کرنے لگے انیس ناگی نے ان کے پاکستان ٹائمز کے کالموں کا جواب ہفتہ وار "قندیل" میں دیا اور پھر یہ دشمنی مستقل ہوتی چلی گئی۔ پاک ٹی ہاؤس اور کافی ہاؤس کی ان ملاقاتوں کے بعد سرکاری ملازمت میں آنے کے باوجود تیس پینتیس برس تک انیس ناگی کی نگرانی ہوتی رہی، بقول ان کے

> "میرے دوست کہتے ہیں کہ میں Persecution mania کا شکار ہوں اور میرے ناولوں کے کرداروں کی بنت بھی بیمار لوگوں کی سی ہے۔ اس قسم کے تجربات میری شاعری میں بھی نظر آتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ میری تحریروں میں یہ اثرات اس نا دیدہ مقدمے کا نتیجہ ہوں جس کا فرانز کافکا کے ناول "دی ٹرائل" میں بڑی صراحت سے ذکر کیا گیا ہے" (ص 117)

انیس ناگی کا کہنا ہے کہ انہوں نے دانستہ طور پر اپنے آپ کو غایت درجہ نارمل بنانے کی کوشش کی، ایک کم گو، محدود لوگوں سے تعلق رکھنے والا نوجوان جو ادب کا بہت شوقین تھا اور دنیا سے لاپرواہ تھا اور جس کے لب و لہجے میں کس قدر اکھڑ پن تھا۔ لیکن ان کا باطن تشنگی، نارسائی اور انکار کے شعلے سے بھڑک اٹھا ہوا ایسی دنیا کے آرزومند رہے جہاں تنہائی کا خوف نہ ہو، مشروط رشتے نہ ہوں۔ اس اثنا میں راں بو اور بودلیران کے ادبی ہیرو بنے رہے وہ انہی جیسی آزاد زندگی کے خواہاں تھے ان کا یہ بھی خیال تھا کہ زندگی کے اصل معنی پانے کے لئے اختلال حواس کی ضرورت ہے اور یہ اختلال سکر کے ذریعے ہی ممکن ہے اور یہی تخلیق کا سرچشمہ ہے۔

> "باہر کی دنیا میری دنیا سے مختلف تھی، یہ تنہائی، جنسی تشنگی اور ابہام کا جہنم تھا کہ میں ابھی تک اپنی شرح نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے اندر منفی رویے ہونے لگے تھے۔ میں اپنے کمرے میں ٹہلتا، اپنے والد کی ناجائز سختی اور بے عزتی مالی تنگی، مستقبل کی تاریکی مجھے اتنا پریشان کرتے کہ میرا جی کرتا کہ میں اتنا نشہ کروں کہ سدھ ماری جائے" (ص 122)

بی ۔اے کے بعد انیس ناگی کو پبلک ریلشنگ آفیسر کے طور پر گوجرانوالہ تعینات ہوئے ۔ جہاں دو ماہ صبر سے کاٹنے کے بعد انہوں نے استعفیٰ دیا اور لاہور پہنچ گئے ازاں بعد اومنی بس میں ٹریفک آفیسر کے لئے درخواست دی، ٹریننگ کے دوران ہی اس ملازمت سے بھی دل اٹھ گیا۔

''جب گورنمنٹ کالج کا بس سٹاپ آیا تو میں کافی پریشان تھا کیونکہ میرا شمار کالج کے مشہور طلباء میں ہوتا تھا ۔ جونہی بس سٹاپ آیا میں نے انسٹرکٹر کو چیچ اور ٹکٹیں پکڑائیں اور بس سے نیچے اتر گیا۔ میں نے اس کے بعد بھی اومنی بس کے دفتر کا رخ نہ کیا''۔(ص127)

اسی زمانے میں انہیں ایکسائز کے محکمے میں سب انسپکٹر کی نوکری ملی یہیں عبدالحق کھاسی اور ڈاکٹر سلیم الرحمان کی دوستی کچھ دوسرے راستوں پر لے گئی ۔ والد ان کارروائیوں سے غافل نہیں تھے ۔ آخر ایک دن پنجاب یونیورسٹی میں ایم ۔اے اردو میں داخلہ لے لیا یہیں انیس ناگی باقاعدہ طور پر اپنی اولین محبت میں مبتلا ہوئے لیکن لڑکی کی اسلام پسندی اور انیس ناگی کی نفسیات پسندی آپس میں نبھاہ نہ کر سکیں ۔ (129) ۔ اسی اثنا میں والد نے انہیں محکمہ اطلاعات میں سرکاری صحافی کے طور پر بھرتی کرا دیا۔ سات آٹھ مہینوں بعد یہ نوکری بھی چھوڑ دی کیونکہ وہ صحافی بننا نہیں چاہتے تھے۔

اس عرصے میں ایک نامعلوم ابہام ان کے دل و دماغ پر پھیلنے لگا، شام ہوتی تو کندھوں میں ایک تناؤ پیدا ہو جاتا جو سرکتا ہوا دماغ کے مختلف گوشوں میں پھیل جاتا۔ دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی زندگی میں جو پہلی لڑکی ملی اس نے ان کی زندگی کا تصور چکنا چور کر دیا۔

''اگر محبت کا مطلب وعظ ہے تو یہ وعظ کسی اور جگہ بھی سنا جا سکتا تھا'' (ص130)

انیس ناگی زندگی میں نیا راستہ چاہتے تھے انہیں اپنے والد کی حالت پر رحم آتا تھا کہ ہر محاذ پر شکست کے باوجود انہوں نے اپنی ظاہری شبیہہ کو ٹوٹنے نہ دیا۔ ان کی محکمانہ ترقیاں روک دی گئیں ۔ جھوٹی انکوائریاں نافذ کی گئیں ۔ وکالت کا لائسنس منسوخ ہوا، مکان جلائے گئے، کوئی بینک بیلنس نہ بن سکا۔ اولاد سرکش ہو گئی خانگی زندگی بگڑ گئی پھر بھی انکے ظاہری رویے میں کوئی فرق نہ آیا۔

ادھر انیس کے ہاں انہی معاملات نے ردعمل پیدا کیا وہ سوچتے "سوچنا بے کار ہے، یہ ایک نشہ ہے جو عمل کی صلاحیت سلب کر لیتا ہے" یہی کیفیت زیادہ سے زیادہ مطالعے کا ثمر بنتی گئی۔ کالج اور یونیورسٹی کا زمانہ جذباتی پسپائی کا زمانہ ثابت ہوا اس اثنا میں انہوں نے دوستوفسکی کا ناول "The Idiot" پڑھا۔ ریستوران کی میزوں اور دیواروں پر تختیاں نمودار ہو رہی تھیں کہ "سیاست پہ گفتگو کرنا منع ہے" اس امتناع کے باوجود دبی زبان میں مارشل لاء کے خلاف احتجاج شروع ہو چکا تھا خفیہ ایجنسیاں بائیں بازو کے ادیبوں کے تعاقب میں تھیں، پاک ٹی ہاؤس میں تشویش کی لہر دوڑ رہی تھی، اخباروں میں نئی شاعری کے متوالوں کا مذاق اڑایا جا رہا تھا۔ نگرانی کے اس عمل میں انیس ناگی کے لیے چھپنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ اسی پکڑ دھکڑ کے موسم میں ان کی ملاقات محمد حسن عسکری سے ہوئی جنہوں نے اس نگرانی کی واضح تصدیق کر دی۔ آخر طویل انتظار کے بعد ایم۔ اے کا نتیجہ نکل آیا۔ وہ امتحان میں اول رہے اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ انہوں نے پچاس برس کی عمر میں پی۔ ایچ۔ ڈی مکمل کی۔ بطور لیکچرار پہلی ملازمت ایم۔ اے۔ او کالج لاہور سے شروع ہوئی۔ دو ماہ کے بعد بورڈ نے ان کی تقرری کی منظوری نہ دی اور کہا وہ بہت زیادہ مغرب زدہ ہیں اور مشرقی روایات کے تعلیمی ادارے میں نہیں چل سکتے۔ (ص157)

اس واقعے نے انیس ناگی کی زندگی کا رخ موڑ دیا، ان کے پاس علم کی دولت تھی، وہ ہر بات کے محرک اور اس کے نتیجے کا تجزیہ کرنے پہ قادر تھے لیکن یہ سمجھنے سے قاصر کہ زراج، بے بسی اور بے چینی کیوں ایک مستقل صورت حال بنتی جا رہی ہے، انہیں زندگی کی معنویت ختم ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ ان دنوں انہوں نے چارلس بودلیئر کی دو کتابوں کا مطالعہ کیا، ایک کتاب ماں کے نام لکھے گئے خطوط پر مبنی تھی، اس مطالعے سے ایک صوفیانہ برداشت پیدا ہوئی، اسی اثنا میں وہ تنقید کی جانب مائل ہوئے۔

خوف اور دہشت کی مستقل کیفیات کے زیر اثر انہیں کبھی کبھی محسوس ہوتا کہ وہ سڑک پر چلتے ہوئے گرفتار کر لیے جائیں گے، اسی اضطراب میں ایک دن وہ لاہور کے ڈائریکٹر محکمہ تعلیم کے دفتر جا پہنچے اور انہیں چھ ماہ کے لئے گورنمنٹ کالج لاہور میں اردو کا عارضی لیکچرار لگا دیا گیا جہاں

ان کے تین بھائی زیرِ تعلیم رہے تھے اور سپورٹس کے اعلیٰ درجے کے کھلاڑی تھے، ان کی بڑی بہن نے بھی یہیں سے فائن آرٹس میں ماسٹرز کیا تھا۔ ان دنوں ڈاکٹر نذیر احمد کالج کے پرنسپل تھے، اسی عرصہ میں ایک بار پھر پاک ٹی ہاؤس ان کے معمولات میں شامل ہوا جسے کالج میں سرخوں کا گڑھ سمجھا جاتا تھا، اس زمانے میں ''سرخا'' اُسے کہتے تھے جو لمبے بال رکھتا، پائپ پیتا، بغل میں کتابوں کا بنڈل لئے ہوٹلوں میں گھومتا اور آزادانہ گفتگو کرتا، انیس ناگی کا حلیہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ البتہ اب ادبی محافل اور مشاعروں کی شرکت نے انہیں خود اعتمادی عطا کی تھی، ماجد خاں، آفتاب گل اور شفقت رانا جیسے کرکٹر اُن کے شاگرد تھے۔ ازاں بعد سرمد صہبائی، راحت نسیم ملک اور نصیر ملکی بھی اس فہرست میں شامل ہوئے۔ یہیں پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر سردار مظہر علی خاں کا بیٹا طارق علی طلبا کے لیڈر کی حیثیت سے بیان داغنے لگا اور شاید اسی قسم کی سرگرمیاں انیس ناگی کی اس ملازمت کے خاتمے کی وجوہات بنیں، بقول ڈاکٹر نذیر احمد

> ''تم نا سمجھ ہو تم شعر و شاعری کے جوش میں ہنگامے کرتے رہے ہو، ملک میں مارشل لاء لگا ہوا ہے ہر لیکچرر کی مستقل تعیناتی سے پہلے اس کے بارے میں خفیہ رپورٹ حاصل کی جاتی ہے اور تمہاری رپورٹ اچھی نہیں۔'' (ص169)

یہ خبر شخصی معدومیت کا ایک اور شاخسانہ بنی، کچھ عرصے کے بعد انہیں گوجرہ کے انٹر کالج میں تبدیل کر دیا گیا، زندگی بے جواز معلوم ہونے لگی وہ ایک طرح کے پیرول پر تھے جنہیں مشورہ دیا جا رہا تھا کہ انہیں بائیں بازو کے لوگوں سے نہیں ملنا چاہیے۔ انہیں مشورہ دیا گیا کہ ان کی بقا کے لئے سرکاری ملازمت ضروری ہے، وہ لائل پور سے ستائیس اٹھائیس میل کے فاصلے پر گوجرہ جیسے قصباتی شہر میں منتقل ہو گئے۔

> ''گوجرہ ایک جہنم تھا۔۔۔ یہ ایک نامعلوم منطقہ تھا جس میں مجھے بھٹکنا تھا، میں شروع سے دیہاتیت سے بہت گھبراتا ہوں، بول چال میں کھردرا پن، ہر بات میں مداخلت اور بات بات پر حیرت کا اظہار۔'' (ص175)

زندگی کا ایک برس اسی علاقے میں بسر ہوا۔ ایک ست روسا کالج، اکھڑ طلبا اور چغل خور

پروفیسر، یہیں انہیں ایک فلم میں کام کرنے کی پیش کش ہوئی، آخر کار کرامت حسین جعفری پرنسپل گورنمنٹ کالج لائل پور کے ایما پر انہیں لائل پور کالج میں تبدیل کر دیا گیا جہاں ایم۔اے اردو کی کلاسیں شروع کی جا رہی تھیں۔ یہ کالج دھوبی گھاٹ کے نام سے مشہور تھا اور ادب کے حوالے سے کئی استاد کافی معروف تھے، یہاں پہلے وہ کالج ہاسٹل کے گیسٹ روم میں اور ازاں بعد پیپلز کالونی کے ایک مکان میں منتقل ہو گئے اور مقابلے کے امتحان کی تیاری شروع ہوئی۔ لائل پور میں ان کا قیام اڑھائی برس کے قریب رہا، جسے وہ جلاوطنی کی زندگی قرار دیتے ہیں۔ یہیں انہوں نے صوبائی اور سنٹرل سروسز کے امتحانات دیے وہ دونوں امتحانات میں پاس ہو گئے۔ یہ 1965ء کا زمانہ تھا۔ ریڈ کراس اور سول ڈیفنس کے ادارے یکا یک حرکت میں آ گئے۔ یہ ایمرجنسی اور جنگ باقاعدہ طور پر تو صرف سترہ دن رہی لیکن اعصابی طور پر لوگوں کو کئی سالوں کے لئے مضطرب کر گئی۔

امتحان کے نتیجے کے طور پر انیس ناگی کو ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر (مجسٹریٹ) منتخب کیا گیا ازاں بعد انہیں ایکسپورٹ اور امپورٹ کے محکمے کے لئے نامزد کیا گیا اور کہا گیا کہ وہ بائیں بازو کے شاعر ہیں اس لئے سپریئر سروسز کے لئے موزوں نہیں۔ ان کی پہلی تعیناتی سیالکوٹ میں ہوئی۔ انہیں محسوس ہوا کہ وہ فرانز کافکا کے "جوزف کے" کی طرح نامعلوم جرم کی پاداش میں سزا سہتے رہیں گے کیونکہ ان کی سوسائٹی میں اینٹی ہیرو کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ انہیں سیالکوٹ سے بیس پچیس میل دور چوبارہ سیکٹر میں بحالیات کا شعبہ دیا گیا۔ سیالکوٹ میں زندگی ایک روٹین بن کر رہ گئی، یہیں پہلی بار انہوں نے ایک شخص کو پھانسی لگتے دیکھا۔

> "اس واقعے کے بعد میرا سونا ناممکن ہو گیا تھا جب بھی آنکھ لگتی تو سامنے دیوار پر ایک رسی کا سایہ نمودار ہوتا جس کے ساتھ لٹکی ہوئی لاش جھٹکے لے رہی ہوتی۔" (ص223)

جنگ ختم ہوئی، امن معاہدہ ہو گیا لیکن پاکستان ہندوستان کے جذباتی محاذوں پر ہمیشہ ایک سرد جنگ جاری رہی، اسی اثنا میں انیس ناگی کے ایک بھائی جرجیس جنہیں پیار سے گھر میں صوفی کہا جاتا تھا کا جہاز ہندوستانی فضا میں لاپتہ ہو گیا، ہوائی جہاز کے اس حادثے کو ایک فوجی کیوژلٹی قرار

یا گیا، لاہور چھاؤنی میں ایک سڑک ان کے بھائی کے نام سے منسوب ہے۔

''میں جب چھاؤنی جاتا ہوں تو اس سڑک کو دور سے دیکھتا ہوں لیکن اس پر سے نہیں گذرتا، میرے بھائی کی سرگذشت کتنی مختصر ہے۔'' (ص227)

سیالکوٹ سے بطور مجسٹریٹ ان کا تبادلہ لاہور ہوا اور پھر وہ بطور اسسٹنٹ کمشنر شجاع آباد، سرگودھا در گوجرانوالہ میں تعینات ہوئے، بطور ایڈمنسٹریٹر و محکمہ زکوٰۃ سے بھی وابستہ رہے۔ انہوں نے طلیمنٹ کمشنر لاہور کی حیثیت سے (برائے متروکہ جائیداد) خدمات انجام دیں، بطور ڈپٹی سیکرٹری وٹرانسپورٹ، فوڈ، ایجوکیشن اور ایس این جی ڈی اے کے محکموں سے منسلک رہے۔ وہ بطور مینجنگ ائریکٹر پنجاب انڈسٹریل ڈویلپمنٹ بورڈ، پنجاب منرل ڈویلپمنٹ کارپوریشن میں خدمات انجام یتے رہے۔ وہ جنرل ایڈمنسٹریشن کے شعبے میں ایڈیشنل سیکرٹری رہے، انہوں نے کمشنر مہاجرین کی یثیت سے کام کیا اور ازاں بعد ممبر بورڈ آف ریونیو پنجاب کے عہدے سے گریڈ اکیس میں ریٹائر وئے۔ اس اثناء میں اپنے ملازمتی، پیشہ ورانہ تجربات سے ناول نگاری کے میدان میں پاکستانی عاشرے کی کئی تصویریں بنانے میں کامیاب ہوئے، یہ ناول اپنی جگہ ایک تاریخ ہیں۔

وہ ریٹائرمنٹ کے بعد کچھ عرصہ تک گورنمنٹ کالج (جواب یونیورسٹی کا درجہ حاصل کر چکا ہے) یں شعبہ اردو کی پوسٹ گریجویٹ کلاسز سے منسلک رہے۔ 2008ء میں اس مصروفیت سے راغت کے بعد اپنی تحریروں کا نفسیاتی جائزہ لیتے ہوئے بطور ناول نگار ایک ناول ''سکریپ بک'' لکھنے میں مشغول ہیں۔ انیس ناگی کی ہنگامہ خیز زندگی نے اپنے گرد اپنے پیروکار بھی جمع کر کھے ہیں جو ان کے فکروفن اور تعلیمات کے ساتھ ساتھ مصنف کی پسندیدگیوں اور ناپسندیدگیوں کا بھی گہرا شعور رکھتے ہیں۔

ان کے ایک مداح احمد عقیل روبی کا کہنا ہے۔

''انیس ناگی شکل وصورت سے شاعر ادیب کم اور امریکی کاؤبوائے فلموں کا ہیرو زیادہ لگتا ہے۔ لمبا قد، فراخ ماتھا، لمبوترا چہرا، گورا چٹا رنگ، موٹی موٹی آنکھیں، گلے میں اپنا چمڑے کا تھیلا ڈالے یا ہاتھ میں تمباکو کا پاؤچ پکڑے جا رہا ہو تو ایسے لگتا ہے

جیسے بی بی سی (لندن) کا نمائندہ کسی سپیشل مشن پر پاکستان آیا ہے۔ ٹی ہاؤس میں
طلوع ہوتو اسے دیکھ کر کچھ چہرے غروب ہو جاتے ہیں۔"

(خاکہ۔۔۔انیس ناگی، ص9)

انیس ناگی لفظ اختلاف پر اپنے وجود کا انحصار رکھتے ہیں اور اسی بنیاد کو مضبوط بنانے میں مسرت محسوس کرتے ہیں۔ اس اختلاف کی بنیاد علمی اور نظریاتی ہوتی ہے۔ اس ضمن میں وہ کئی معرکہ آرا محاذ آرائیوں میں مصروف رہے ہیں۔ قرۃ العین حیدر، انتظار حسین اور کچھ دوسرے ادیبوں کی فکشن نگاری کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، بقول عقیل روبی

"عام زندگی میں افسری اس کے قریب سے نہیں گذری، اسے کوئی Comple نہیں، جمعہ کو علامہ اقبال ٹاؤن (لاہور) کی مارکیٹ میں نیکر بنیان پہنے گھر کا سودا سلف خریدتا، رسالے اور کلب کا کاغذ اردو بازار سے کاندھے پر اٹھا کر خود پریس چھوڑ آنا اور پھر پریس سے چھپا کاغذ کاندھے پر رکھ کر جلد ساز کے پاس رکھ آنا اس کا معمول ہے۔ پریس اور مارکیٹ والے اسے دیکھتے رہ جاتے ہیں، شیلے نے اپنی مشہور نظم (Quee Mab) اپنے ہاتھ سے لکھ کر اس کی ساٹھ کاپیاں بنائیں اور خود جا کر لوگوں میں تقسیم کیں۔ انیس ناگی کا "دانش ور" چھپ جائے تو خود ٹی ہاؤس آتا ہے اور اپنے جاننے والوں کو خود دستخط کر کے دیتا ہے اور خوش ہوتا ہے۔ یہ انیس ناگی کی اپنے کام سے محبت کی علامت ہے اور یہ انیس ناگی کا معمول ہے۔" (ص13)

انیس ناگی تمام عمر مغربی اور روسی ادب کے رسیا رہے۔ سینٹ جان پرس، سارتر، کامیو، پابلو نرودا، ٹی ایس ایلیٹ اور دستوئسکی ان کے پسندیدہ ادیب ہیں۔ ان کی شخصیت پر دستوئسکی اور اس کی تحریروں کے گہرے اثرات ہیں۔ ان کے نزدیک انسان اور زندگی کی دائمی صورت حال ہمیشہ گھمبیر رہتی ہے ان کے ایک پرستار زاہد مسعود کا کہنا ہے۔

"انیس ناگی کی شخصیت پیچیدہ اور قابل مطالعہ ہے مگر جو لوگ ان کو سمجھنا چاہیں انہیں ان کی سوانح "ایک ادھوری سرگذشت" کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔ ان کی شخصیت

کی بہت سی پرتیں ان کے ناولوں، نظموں اور کہانیوں میں کھلتی چلی جاتی ہیں جس
کے نتیجے میں وہ ایک حساس، معصوم، ہمدرد شخص کے طور پر سامنے آتے ہیں، تاہم وہ
لوگ ان سے دور رہیں جو تعلقات کے ضمن میں حساب کتاب کے قائل ہیں وہ محبت
کے پرچار کے قائل ہیں۔ اساطیری تصورات پر ان کے یقین نے انہیں اپنے
اردگرد سے تھوڑا جدا کردیا ہے جس کے اثرات کو وہ ذات کی بیگانگی کا نام دیتے ہیں،
انیس ناگی زر اور زن سے بیگانہ رہے ہیں، اپنے آپ میں رہتے ہیں اور یہی ان کا
تصوف ہے۔" (ص 211)

بنیادی بات یہ ہے کہ انیس ناگی کی تحریروں میں تذبذب اور استقلال کے جو حوالے ملتے ہیں
ان کے تار تحریر دورنگ کی ڈوران کے اپنے شخصی ہیولے کے ہاتھ میں ہے جو اپنی موجودگی کے
یقین کے لئے زندگی کی مسلسل چلتی ہوئی کہانی کو بار بار "ری وائینڈ" کر کے دیکھنے کے عمل میں
مصروف ہے اور کسی معجزے کا منتظر ہے۔ معجزہ جو ہمیشہ پردۂ غیب میں رہتا ہے۔

وقت کے دوزخ میں ہم جلتے رہے
بیگانگی کے دن کٹے اور رات بھی
بیگانگی اک دائرہ ہے آگ
جس کے اندر ذات کا ہے آئینہ
کچھ فاصلے پر لوگ ہیں
نامہربان، ناآشنا

1975ء میں سرکاری سطح پر انیس ناگی کو الجزائر جانے کا موقع ملا۔ یہ عرصہ دو برس پر محیط
تھا، یہیں مصنف کو فرانسیسی ادب سے یکسوئی کے ساتھ استفادے کا موقع ملا۔ 1976ء کے
اختتام پر وہ لندن گئے اور پھر اگلے برس پیرس، فرانس میں قیام کے دوران ان کی تین خواہشیں
تھیں پہلی سارتر سے ملاقات جو اپنی بدخوئی اور تکبر کی دھوم رکھتا تھا، دوسری بودلیر کے مقبرے
کی زیارت اور تیسری شارل ویل جانے کی تمنا جہاں آرتھر اس بودفن تھا۔ انیس ناگی کی تیسری

خواہش ادھوری رہی تاہم انہوں نے اس عرصے میں راں بو کی نظم "جہنم میں ایک موسم" کا اردو ترجمہ کیا۔ 1983ء میں انہوں نے ٹوکیو/جاپان کا سرکاری دورہ کیا، وہ جاپانیوں کے نظم وضبط اور ڈسپلن سے متاثر ہوئے یہیں انہیں لاطینی امریکہ، افریقہ، جنوبی ایشیاء کے شعراء سے ملنے کا موقع ملا۔

ازاں بعد 1994 میں انہیں حکومت کی جانب سے روم، ہانگ کانگ اور تھائی لینڈ جانے کا اتفاق ہوا۔

2001 میں وہ اپنے اکلوتے صاحبزادے ڈاکٹر دانیال ناگی سے ملاقات کیلئے آئر لینڈ گئے۔ اسی دوران وہ ڈبلن بھی گئے۔ آئر لینڈ کی خوبصورتی نے انہیں متاثر کیا۔ ان کا خیال ہے کہ آئر لینڈ ایک غیر اہم ملک ہے جہاں اپنے کلچرل ہیروز کو بے نمایاں کرنے کا رواج ہے۔

انیس ناگی کی تصانیف

شعری مجموعے

بشارت کی رات	1966	غیر ممنوعہ نظمیں	1974
نوحے	1976	زرد آسمان	1979
روشنیاں	1984	بے خوابی کی نظمیں	1987
آگ ہی آگ	1989	ابھی کچھ اور	1990
بے خیالی میں	1992	بیابانی کا دن	1994
صداؤں کا جہاں	1995	درخت میرے وجود کا	1997
بیگانگی کی نظمیں	2000 کلیات	جشن ایک آندھی	2007

انیس ناگی کی ناول نگاری

دیوار کے پیچھے	1980	میں اور وہ	1983
زوال	1989	ایک گرم موسم کی کہانی	1990
ایک لمحہ سوچ کا	1991	محاصرہ	1992
قلعہ	1994	چوہوں کی کہانی	1995
کیمپ	1998	پتلیاں	2003
ناراض عورتیں	2004	313 بریگیڈ	2007
فصیلیں (مجموعہ چار ناول)			

انیس ناگی کی افسانہ نگاری

حکایات	گردش
وقت کی کہانیاں	بدگمانیاں
افسانے	

خود نوشت

ایک ادھوری سرگذشت

نثری اور شعری تراجم

نثری تراجم

سیفس کی کہانی (فلسفہ)	البیر کامیو	(فرانسیسی ادب)
طاعون (ناول)	البیر کامیو	(فرانسیسی ادب)
کایا کلپ (افسانہ)	فرانز کافکا	(فرانسیسی ادب)
تہہ خانے سے (ناول)	دوستوفیسکی	(انگریزی)

شعری تراجم

جہنم میں ایک موسم	آرتھر راں بو	(فرانسیسی ادب)
ہوا میں	سینٹ جان پرس	
جلاوطنی اور دوسری نظمیں	سینٹ جان پرس	
ٹی ایس ایلیٹ کی نظمیں	ٹی ایس ایلیٹ	(انگریزی ادب)
پابلو نرودا کی نظمیں	پابلو نرودا	(انگریزی ادب)

Poem of Iqbal
Modern urdu poems from pakistan
Ancient Lahore (Edited and Prefaced)

تنقید و تحقیق

تنقید شعر	1966	نذیر احمد کی ناول نگاری	1967
نیا شعری افق	1969	شعری لسانیات	1969
تصورات	1976	مذاکرات	1986

غالب ایک شاعر، ایک اداکار 1990

شعری لسانیات (استعارہ، علم المعانی اور شاعری کا تعلق) 1990

مشاہدات	1993	غالب پریشاں	1993
غالب کا مقدمہ، پنشن	1996	میری ادبی بیاض	1996
معاصر ادب	1997		
سعادت حسن منٹو) نئے ادب کے معمار)	1999	سعادت حسن منٹو کی کہانی	2005
میراجی ایک بھٹکا ہوا شاعر	2006	افتخار جالب ایک مطالعہ	2006
نئے افسانے کی کہانی	2008		

تاریخ، ثقافت اور نفسیات

عمومی نفسیات	1995	لاہور جو شہر تھا	1976
جنس اور وجود	2000	پاکستانی اردو ادب کی تاریخ	2004

کالم نگاری

پاکستان ٹائمز	1989-90	انگریزی
نیشن	1990	انگریزی
فرنٹیئر پوسٹ	1993-94	انگریزی
انڈیپنڈنٹ ویکلی	2001-02	انگریزی
جنگ	2004	اردو
نیوز	2008	انگریزی

☆☆☆☆☆

انتخاب

نئی شاعری	جمالیات، لاہور
میراجی کی نظمیں	جمالیات، لاہور
بھرے پھل (انتخاب پنجابی نظم)	پنجابی مجلس، لاہور
سعادت حسن منٹو ایک مطالعہ	مقبول اکیڈمی، لاہور

☆☆☆☆☆

ادارت

مدیر رسالہ دانشور 1987 تا حال

صورت حال کی نظم نگاری

انیس ناگی ہمیشہ سے تعمیر، انہدام اور از سرِ نو تشکیل کے عمل میں معروف رہے ہیں۔ یہ شعوری اضطراب اور اپنے تجربات کو نئے سرے سے نئے پیمانوں میں ڈھالنے کا شوق جس قدر ہمیں انیس ناگی کے ہاں نظر آتا ہے اس کی دوسری باقاعدہ مثال مشکل سے ملے گی چنانچہ یہ کاروانِ وجود جو کہیں ٹھہرنے کا خطرہ مول نہیں لیتا نئی شانِ وجود کے ساتھ ظہور پذیر ہوتا ہے۔

زیرِ نظر مضمون میں ان کی شاعری کے مجموعی تاثرات کے احاطے کے لئے ان کے کلیات "بیگانگی کی نظمیں" کا انتخاب کیا گیا ہے جس کے دیباچے میں انہوں نے لکھا۔

"بیگانگی کی نظمیں میرے کلیاتِ شعر ہیں۔ ان سے پہلے زرد آسمان اور ایک اور آسمان کے تحت دو کلیات دو مرتبہ شائع ہوئے جن میں اپنے اپنے زمانے کے شعری مجموعوں کو اکٹھا کیا گیا۔ گزشتہ چالیس برسوں میں میں نے شاعری کے نام پر جو کچھ منظوم کیا ہے اسے" بیگانگی کی نظمیں "میں یکجا کیا ہے۔ میں نے اس کتاب کی تدوین میں شعری مجموعوں کے نام حذف کر کے ایک حد تک کل کلام کو مربوط کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ ان کا مطالعہ ایک طویل پھیلی ہوئی نظم کے طور پر کیا جائے۔ اس میں تکرار بھی ہے اور تغیر بھی کیونکہ یہ خاص ملکی اور تمدنی صورت حال کا نتیجہ ہیں۔ چنانچہ میں انہیں صورتِ حال کی نظمیں کہوں گا۔"

انیس ناگی نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ تمام منظومات آزاد نظم اور نثری نظم کے پیکروں میں لکھی گئی ہیں۔ وہ چاہتے تو باآسانی غزل کی جگالی کر سکتے تھے جس سے دانستہ اجتناب کیا گیا ہے کیونکہ شاعر کے نزدیک غزل کی معنویت کا امکان ختم ہو چکا ہے۔ نئی دنیا ان سے نئے ادراک اور نئے

شعور کا مطالبہ کرتی ہے کیونکہ جذباتی اور ذہنی تجزیوں کے ساتھ ساتھ زبان نے بھی تبدیلی کے عمل میں پناہ ڈھونڈی ہے۔ 1960ء کی نئی شاعری کی تحریک نے اس زمانی بُعد کو دور کر کے ادب اور زندگی میں نیا تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

بقول ڈاکٹر انیس ناگی

''میری ذاتی صورت حال اور میرے ادبی پس منظر کا میری شاعری سے گہرا تعلق ہے۔ میں نے نئی شاعری کے لئے نظریہ سازی کی، غیر ملکی شاعری کے بہت سے تراجم کئے۔ اس مسائل کی غایت نئے شعری مزاج کو روشناس کرانا تھا۔ میری شاعری میں بہت سے تغیرات نمودار ہوئے جو علامت پسندی سے شروع ہو کر بیانِ محض کی صورت تک جا پہنچے۔ شاعری بیک وقت ایک پرسنل اور کلچرل ہسٹری ہوتی ہے جس میں جھوٹ اور بناوٹ کی گنجائش نہیں۔۔۔ مجھ پر مغرب زدگی کی بھی تہمت لگائی گئی ہے میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ مجھے راں بونے اختلالِ حواس کے ذریعے نئی جہتیں تلاش کرنے اور زبان کی توڑ پھوڑ کرنے کا طریقہ بتایا، سینٹ جان پرس نے مجھے شکوہ، زبان سازی اور ایک عالمی سطح پر شاعری کرنے کا درس دیا اور سب سے آخر میں پابلو نرودا نے عام زندگی کے معمولات سے بڑی شاعری اور کائنات کے عناصر کو انسانی احساس سے متصف کرنے کا گر بتایا۔ ان شعراء کے اسالیب ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن میری ذات میں سے گذرتے ہوئے ان کی شکلیں بدلتے بدلتے ایک اور رخ اختیار کر گئی ہیں۔۔۔ یہ دنیا ایک ایمپریکل تجربہ ہے اسے میں صرف اپنی آنکھ سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ بیگانگی کی نظمیں میری اپنی سرگذشت بھی ہے اور ایک عہد کا نوحہ بھی، ان دونوں کی حدیں آپس میں ملی جلی ہیں۔''

اسی بیان کی روشنی میں ہم انیس ناگی کی نظم نگاری کا درجہ بدرجہ جائزہ لیتے ہیں۔

1947ء سے 1958ء تک کا زمانہ انیس ناگی کی تعلیمی سرگرمیوں کا زمانہ ہے شعوری طرح پر ہمیں اس صورتِ انکار کی تشکیل کا زمانہ کہہ سکتے ہیں اخلاقی نظام کی پر ہجوم بندشوں کے ٹکراؤ میں وہ

انسانی جبلتوں کا نعم البدل تلاش کر رہے ہیں ۔ تاریخ اور تہذیب سے متنفر انسان شخصی جبلتوں کے استعمال، انجماد اور انتشار کا شکار ہے ۔ بقول انیس ناگی

> 1958ء کی بات ہے افتخار جالب لا کالج میں تھے اور میں گورنمنٹ کالج میں، ہم ہر شام بیٹھ کر باتیں کرتے اور نظمیں سناتے ، ہم نے سوچا کہ بات آگے بڑھنی چاہیے ۔۔۔ جیلانی کامران ایڈنبرا سے نئے نئے آئے تھے انہوں نے ہمیں اپنا مجموعہ استانزے دیا ہم بہت متاثر ہوئے ۔۔۔ انہوں نے ایک کتاب چھاپ دی اور نظریہ سازی کا کام شروع ہو گیا ۔ حلقہ ارباب ذوق کا وہ زمانہ بہت ظالمانہ تھا ۔۔۔ جتنے ژولیدہ ادیب تھے ہم نے ان کی صفوں کو درہم برہم کیا، انہوں نے کہا کہ نئے شاعر بے بحر نظمیں لکھتے ہیں، کوئی اخبار ہمیں نہیں چھاپتا تھا ۔۔۔ چنانچہ ہم نے اس زمانے میں دس دس روپے اکٹھے کئے اور پہلا شعری انتخاب "نئی نظمیں" کے نام سے شائع کرایا ۔''

(نئی شاعری کا منصوبہ، نئی شاعری ایک تنقیدی مطالعہ از افتخار جالب ص 47)

ان کے نزدیک نئی شاعری کی دریافت اس کا تصوراتی اور جذباتی لہجہ ایک مخصوص تاریخی اور تمدنی سیاق و سباق سے ماخوذ ہے ۔ 1947ء کے فوراً بعد کی منظومات میں جس جذباتی اضمحلال اور ذہنی افسردگی کا احساس ملتا ہے وہ پرانے ثقافتی اثاثے سے علیحدگی کا ناسٹلجیا ہے ۔ 1936ء کی ترقی پسند تحریک نئی تقسیم کے باعث بے وجود ہو گئی اور جذباتی اسلوب کا طریق کار بے معنی ہو گیا، تصورات بھی زندہ آدمی کی طرح موت سے پہلے تسلسل اور بقا چاہتے ہیں لیکن نئے عہد میں یہ تصورات مر گئے ۔ ن ۔ م راشد، فیض احمد فیض، یوسف ظفر، ظہور نظر، قیوم نظر، مجید امجد، ضیا جالندھری اور مختار صدیقی کے ہاں اسی کشمکش کے باعث زندگی اور موت دست گریباں دکھائی دیتی ہے ۔ یہیں راشد مرگِ اسرافیل پر آنسو بہانے کی ذہنی اذیت سے گذر رہے ہیں ۔ لیکن ان کے ہاں فرد کا تصور کائناتی استعارہ نہیں بن پایا ۔

دوسری جنگ عظیم نے بین الاقوامی جغرافیہ میں تبدیلی کے عمل کو مزید تیز کیا، نیا یورپ اور نیا ایشیا نئے مسائل سے دوچار ہیں ۔ یہاں مادی دُنیا کی تصوراتی سطح بدل گئی ہے ۔ جذباتی نظام غیر مربوط

ہے نیا انسان اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود تقلیدی نہیں اجتہادی ہے وہ بیک وقت مختار کل اور بے بس ہے۔ وہ ذہنی آشوب کا شکار ہے اس کا کرب ذاتی بھی ہے اور کائناتی بھی۔ اس کی زندگی خود ایک تجربے کا درجہ رکھتی ہے۔

نیا شاعر جس انسانی تصور کو مرتب کر رہا ہے وہ آدرشی تصور نہیں وہ ایک معنویت کی تلاش کا تصور ہے۔ اس لئے نئے شاعروں کی منظومات اور رنگارنگی، نفسیاتی افتادِ طبع اور ادبی تربیت کے ساتھ ساتھ نئی آگہی اور نئے شعور کی یگانگت ملے گی۔ ان شاعروں میں ذہنی اشتراک کی بڑی بنیاد علامت کا شعوری استعمال ہے۔

علامت اور علامتی پیرایے سے ابہام اور افہام دونوں جنم لیتے ہیں علامت کا تعلق ادراک و اظہار سے ہیں یہ صرف حیاتی تجربے سے متعلق نہیں بلکہ اس میں ذہنی تجربے بھی شامل ہیں، نئی علامتوں اور استعاروں کی آفرینش ایک جرأت مندانہ فعل ہے۔

نئی نظم کے قاری کے لئے الفاظ افہام کا ذریعہ ہیں اور شاعر کے لئے تخلیقی تجربہ، شاعر کا لسانی پیرایہ اس کا جذباتی پیرایہ ہے۔ اس لئے نئی لسانی تشکیلات پر غور کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ شاعر کے الفاظ کا انتخاب ایک معاشرتی ذمہ داری ہے۔ لفظ معاشرتی روابط کی بنیاد ہوا کرتے ہیں۔ قاری اگر الفاظ کی ترتیب پیش کردہ نمونے سے ہم آہنگی محسوس نہیں کرتا تو شاید نئی شاعری اس کے لئے بجھارت بن جائے، اسی لئے نیا شاعر نئے لسانی پیرائے کی تشکیل میں مصروف ہے۔

"کتابیں میرا جنگل ہیں
جنہیں میں کاٹ کر رنگیں معانی کے ہیولوں میں چمکتی صورتوں سے دور
تنہا حرف کے صدمات سہتا ہوں
کہ میں خود آگہی کے بھاری سانسوں کا سمندر ہوں
جسے نمکین پانی کی سزا آبادیوں سے دور رکھتی ہے۔"

لفظوں کے اس جنگل میں نئی شاعری کا منصوبہ بنانے والوں نے اپنی اپنی کتابوں کے دیباچے میں ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا تھا، جیلانی کامران کی استانزے، عباس اطہر کی دن

پڑھے دریا چڑھے، زاہد ڈار کی ''محبت اور مایوسی کی نظمیں'' نئی شعری واردات اور نئے الفاظ کی تلاش کا اعلان کرتی کتابیں تھیں ۔ افتخار جالب کی ''ماخذ'' اور لسانی تشکیلات شعری سازی کے موزہ پیمانوں سے انحراف کا ایک اور ثبوت تھی ۔ نئی شاعری کا یہ فلسفہ اور اس کی روایت انیس ناگی نے کس طرح نبھائی اس کے لئے ہم ان کی سب سے پہلی کتاب ''بشارت کی رات'' کی ورق گردانی کرتے ہیں۔

بشارت کی رات :

یہ کتاب 1966 میں شائع ہوئی ۔ موضوع اور کرافٹ کے اعتبار سے ہم اسے موضوع کی تلاش، تبدیل ہوتے رجحانات اور نئے لسانی اطوار کا تجربہ کہہ سکتے ہیں ۔ یہ وہی اشارے ہیں جن کی جانب انیس ناگی اپنی تنقیدی کتاب ''نیا شعری افق'' میں اشارے دے چکے ہیں ۔ شعری حقیقت کی تفہیم کے لئے ابلاغ کے مسائل، علامت نگاری، واردات کا بیان، ذاتی اور سماجی مسائل، شاعری کی اولین ترجیح ہیں۔

رات بھر میں ٹین کی چھت پہ کھڑا
اس شہر میں بارود کی مانند پھٹتے تیز رنگوں کا تماشا دیکھ کر گھبرا گیا
وہ دھول کے گھونگھٹ میں سویا زرد تھا، بے تاب تھا
کچھ لوگ دھیمے سے سروں میں مرثیہ پڑھتے ہوئے
کندھوں پہ لمبی شاخ رکھے
تیرگی کی سمت سے آتی ہوا، جاتی صدا کو ڈھونڈتے تھے
☆☆☆☆☆☆
جو ابھی کچھ دیر پہلے خوبصورت اجنبی کی موت کا پیغام بن کر
تیز چلتی ریل کی مانند اڑتی جا رہی تھی
شہر سے شہروں تلک
مر گیا ہے، مر گیا ہے

جو ہمارے درمیاں خواہش، مصیبت کی تمنا کو جگاتا

زندگی میں زندگی کی گرم سی حیوانیت کے ولولے میں

صورتوں کو لفظ دیتا اور کہتا

''موسموں کی بات چھوڑو،

آج کی تصویر میں ہی آج دیکھو

کل ہمیشہ کی طرح کل ہی رہے گا

اس عہد کے مارشل لاء کا تشدد، فرد کی آزادی اور اس کی داخلی زندگی توڑ پھوڑ شاعر کا خاص موضوع ہے۔ جسے بیان کرتے ہوئے شاعر کا غصہ اور ہیجان کئی رنگ بدلتا ہے۔ ان نظموں کو اگر شاعر کی سرگذشت کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو یہ زمانہ ملازمت کی ابتدا کا وہ زمانہ ہے جب شاعر کو قصباتی شہروں میں بھی رہنا پڑا اور اس سے پہلے اپنے والد کی ناراضگی اور سرد مہری کے مستقل تجربے سے بھی گذرنا پڑا۔ کچھ نظمیں رومانی احساسات کا بھی پتہ دیتی ہیں۔ فراق کا دن: خواب اور سیڑھیاں، ہمزاد، بارش میں ایسی ہی نظمیں ہیں۔

انیس ناگی کی تحریروں میں خودرحمی اور احساسِ زیاں کے تجربات ہر بار ایک نئی شکل میں اجاگر ہوتے ہیں۔ ''بشارت کی رات'' کی کئی نظمیں انہی احساسات میں ڈوبی ہوئی ہیں۔

''چراغ روشن کروں تو کیسے

وہ کہہ رہا ہے کہ مدرسوں اور مشین پرزوں، نئی کتابوں کے گردپوشوں

پہ جو لکھا ہے

وہ بے دلی کی علامتیں ہیں (وراثت کا خوف، ص33)

☆☆☆☆☆

مرے واسطے زندگی میں فقط دیکھنے کے سوا

اور کوئی حقیقت نہیں ہے

اسی واسطے صبح سے شام تک دیکھتا ہوں

تجارت گھروں، کارخانوں، سکولوں میں ہاتھ اور لب

آزمائش کے بندھن میں جکڑے ہوئے ہیں۔ (دیکھنے کی خواہش میں جینا،ص40)

☆☆☆☆☆

زوال وہ گندگی ہے

کہ جس میں مرے زمانے کی زرد کونپل اُگی ہوئی ہے

دماغ اجڑے، بدن پریشاں، کہیں نمو کا نشاں نہیں ہے (زوال،ص41)

☆☆☆☆☆

کچھ نظموں میں شہر لاہور کی محبت شاعر کے پاؤں کی زنجیر بنی ہے۔

کس طرح چھوڑ جائیں یہ بستا ہوا شہر لاہور

ہر اک گلی جس کی قدموں کے پھیلے نشانوں

مکانوں کی ہر ایک شیشہ، رطوبت بھرے سانس

یادوں کی رنگین صورت سے آباد ہے

سلامت رہے شہر لاہور............

اور سلامت رہیں اس کے دیوار و در

اور سلامت رہیں اس کے باسی جنہیں دھول سونا، ہوا پھول ہے" (ص43-48)

یہ نظمیں 1965 اور اس کے بعد کے زمانے کا احاطہ کرتی ہیں۔انیس ناگی کی اولین کتاب میں ہذیان کی ایک خاص کیفیت ہے۔وہ شہروں کی معروف اور گھٹی ہوئی زندگی سے متنفر ہیں۔ کبھ انہیں ہر طرف شور سنائی دیتا ہے۔کبھی انہیں چہرے مسخ دکھائی دیتے ہیں۔کبھی وہ اپنے آپ کو مفرور سمجھنے لگتے ہیں جو کنگال زندگی کی پیہم ہزیموں سے منتشر ہو چکا ہے اور اس کی بحالی کا کوئی امکان نہیں، کبھی وہ یکسوئی کی خواہش میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں۔

گھر ملے تو میں رہوں

تجہار ہوں

سب صورتوں کو شہر کی دہلیز پر میں چھوڑ کر تجہار ہوں

سب کواڑیں بند ہوں

اور لہو کی ساری نہریں خشک ہوں

مرے گھر کی کھڑکیوں میں سرد موسم کی چمکتی کہر میں

مانوس کوئی شکل جھانکے

میں کہوں، یہ بھوت ہے! (اکیلے گھر کی خواہش، ص58)

اس کتاب میں کچھ نظمیں جسمانی ناآسودگی کا استعارہ ہیں

میں خواہش کی پوشاک میں کل سے ننگا پھروں

اس زمیں پر جہاں کوئی سایہ نہیں جو مجھے ڈھانپ لے

میرے پاؤں میں ذروں کی زنجیر جکڑی ہوئی ہے

بدن پر فقط دھول کی اوڑھنی ہے

کسمساتے ہوئے جسم کی دستکیں ہیں

میں ہمسائیگی میں ہی رہتا ہوں

لیکن مری شرم چادر بنی ہے (مجھے شرم آتی ہے، ص61)

''نارسنگھ کی آوازیں'' طویل نظم کا ایک تجربہ ہے۔

صنعتی دور اور اس کی مصیبتوں سے جڑی یہ شاعری اس مادی زندگی کے خلاف احتجاج ہے جس نے انسانوں کو تنہا اور بے مقصد بنا دیا ہے۔ انیس ناگی نے نئے منظر نامے سے نئی معنویت پیدا کرنے کے لئے نئے تلازمے بھی استعمال کئے ہیں۔ منطق اور استدلالی انداز میں رنگی ہوئی یہ نظمیں افسوس اور لاحاصلی کی ایک مستقل مثال ہیں۔ بیمار لڑکے کا باپ، بیمار لڑکا اور دن، ضدی بچے کے کھلونے، کتاب اور سیڑھیاں جیسی نظمیں انیس ناگی کی بچپن کی سائیکی کی تمثیل ہیں۔ موت کے کچھ خیالی اور احساساتی رمزیے بھی کتاب کا ایک مخصوص مزاج متعین کرتے ہیں اور ہم غیر ممنوعہ نظموں تک پہنچتے ہیں۔

''حیات بعد موت کا مجھے پتہ نہیں ہے

جبر کی مصیبتوں سے منتشر حیات بے ثبات ہے'' (درخت کی حقیقت، ص84)

غیر ممنوعہ نظمیں :

اس کتاب کا سنِ اشاعت مجموعہ ''بیگانگی کی نظمیں'' میں 1974 لکھا گیا ہے جبکہ بقول سلیم شہزاد ''انیس ناگی کا دوسرا شعری مجموعہ غیر ممنوعہ نظمیں 68-1967 میں شائع ہوا'' یہ مجموعہ اس نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر شائع کیا جو اس اعتبار سے ایک اہم کتاب ہے کیونکہ اس زمانے میں نئی شاعری کی اشاعت ایک مشکل مرحلہ تھا، کوئی ناشر نئے شاعر کی کتاب کی اشاعت کا رسک لینے کو تیار نہ تھا۔ سیاسی لحاظ سے یہ زمانہ پاکستانی مارشل لاء اور ذوالفقار علی بھٹو کے سوشلزم کی آویزش کا زمانہ تھا، انیس ناگی کے ناول ''دیوار کے پیچھے'' کے ہیرو یعنی سرنے کا عہدِ مشکوک، جہاں مزدور اپنی زندگی بدلنے کا خواب دیکھنے میں مصروف تھا، مادری زبان بولنے والے ملک دشمن تھے اور فکر و نظر جبر کے آہن تلے دبے ہوئے تھے، اس کتاب کی ابتدائی نظموں میں ایک نظم ہے ''ایک عدم پیروی کا مقدمہ'' بہت برس بعد یہ نظم انقلاب لانے والی پارٹی اور اس کے ہیرو کا المیہ ثابت ہوئی۔

ساری عدالت میں سناٹا تھا
حبسِ بے جا اور مقدمہ قتل کا تھا
ٹوٹی کھڑکی سے در آتی تیز ہوا سے
میز پہ رکھی لال کتاب پہ کالی سیاہی بہہ رہی تھی (ص 82)

اسی کتاب میں آگے چل کر لکھی جانے والی ''ادھوری سرگذشت'' کے آثار بھی نمایاں ہوئے۔

مری شکستِ زندگی نمود و غم میں ہے
یہ شش جہات، کائنات کے علوم
جذب اور جنوں کے سلسلے
نہ وارداتِ ہست میں وفا کا وعدہ
اور بقا کی دھوپ بن سکے (مری سرگذشت، ص 86)

بیمار دلہن کے تصور سے نجات پانے والا شاعر 1966ء میں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو چکا

ہے، اس کی انتخاب شدہ عورت مروجہ زمانے کے سب اسرار و رموز سے آگاہ ہے۔ کسی لمحے اسی شاعر نے سوچا تھا۔

کہ میں زندگی کی دلہن
خواہشوں کے بدن کو کہاں پاؤں گا؟
زندگی مختصر ہے
مرے پاس! ابہام کی الجھنوں کے سوا کچھ نہیں ہے
مگر تیرگی میں یہی سوچتا ہوں
کہ زر کی چمک سے بدن کو سجا کر
میں شہرت سے شادی رچا کر
تواریخ پر سے گذرتا ہوا اک نئے شہر کو ڈھونڈ لوں گا (دوران سفر، ص 108)

اس کتاب میں ''بشارت کی رات'' کا کلچر تبدیل نہیں ہوا ہے نہ ہی کوئی خاص لسانی تبدیلی دکھائی دیتی ہے ایک نیا مکالمہ جنم لیتا ہے۔

''وہ کہہ رہی ہے
کہ میرا شوہر دیارِ وحشت کے غم کدے میں
جلی تمازت کے سرخ زنداں میں یوں کھڑا ہے

☆☆☆☆☆

بہت دنوں سے میں خواب میں ہوں
بہت دنوں سے میں اس کی ہستی کے الیے سے نکلتے سورج کو دیکھتی ہوں

☆☆☆☆☆

فضا کے در پر، ضمیرِ عالم کے بند در پر
میں دستکوں کی تھکن سے ٹوٹے بدن کو لے کر
کسے بلاؤں؟

کے جگاؤں

کہ گھر کے آنگن کے پیڑ کی شاخ جھک گئی ہے (فراق کا گیت، ص 164)

اسی صدا کا جواب اسی طرح آتا ہے

''عورتوں کے بدن کی سیاحت سے تھک ہار کر میں

حروفِ تہجی کے چھتیس شہروں کے اس پار اترا

کہ اصوات کے معجزے سے میں

اس عالمِ وارداتِ وجودِ مسلسل کی تعبیر ڈھونڈوں

ازل سے ابد تک رواں ان کہی داستاں ایک ہی سانس کی بحر میں یوں سناؤں

کہ سنتے ہی جس کو نیا عالم زیست احساس کے زاویوں کو

حروفِ تہجی کے چھتیس شہروں میں آباد کر دے

(میرے معنی صوت میں ہیں، ص 133)

''غیر منسوبہ نظمیں'' شہر کے تناظر کو اس منافقانہ رویوں، طبقاتی تقسیم، عدم انصاف اور مذہبی سطحیت کے ساتھ قبول کرتے ہوئے اس ہزیمت اور محرومی کی آب و ہوا کا بھی احاطہ کرتی ہیں جو انسانی رشتوں کی ہمت کی تصویر ہے، یہیں انفرادیت پسندی کا شدید رویہ اپنے لئے نئے کارزار تلاش کرتا دکھائی دیتا ہے، اجتماعی زندگی کی مغلوبانہ تنہائی اور خارجی ماحول کی اکتا دینے والی مانوسیت اس مجموعے کی نظموں کو اجنبیت کے نئے مدار میں داخل کرتی ہیں۔ان نظموں میں تلخی کا ذائقہ ہلکی سی کڑواہٹ میں تبدیل ہوا ہے۔انیس ناگی چونکہ دوران ملازمت مختلف علاقوں کا سفر کرتے رہے اس لئے نظموں کے منظرنامے مختلف اوقات کی مختلف تصاویر پیش کرتے ہیں۔

آتے جاتے لوگو! تم بھی ایک وقوعے کی منطق ہو، تم متذبذب ہو تمہاری پیشانی پر شکنوں کی چادر پھیلتی جارہی ہے اور تمہیں متذبذب دیکھ کر میں اپنا اور تمہارا فیصلہ تو مولود نسلوں کے بے داغ ضمیر کے سپرد کرتا ہوں۔

اس کتاب میں شاعر آزاد نظم سے نثری نظم کی جانب پیش رفت کرتا دکھائی دیتا ہے۔

نوحے :

اس کتاب کو 1976 میں شائع کیا گیا۔ کتاب کی پہلی دو نظموں میں ہماری ملاقات جس انیس ناگی سے ہوتی ہے وہ اپنے آپ کو فیصلہ کن شخصیت بنانے میں مبتلا ہے۔ اپنی موجودگی کے اطمینان کی یہ نظم ایک مختلف شخص کا بیان ہے۔

''رزم گاہِ کشت وخوں میں
بے دلی کے سانحے میں رات دن
اونچے لحن کی گالیوں یا تالیوں کی گونج میں
چپ چاپ تم چلتے رہو
ہر راستے پر تم وجود آدمی کے فیصلے کا بوجھ اپنے ساتھ لے کر
ایک گہری سوچ کی مانند اپنے عصر کی یلغار میں چلتے رہو۔'' (قائم رہو، ص136)

اپنے لئے نئے فکری اور لسانی اسلوب کا یہ واقعہ ہذیان کی راتوں کا وہ شاندار ثمر ہے کہ انیس ناگی ''نوحے'' کو اپنی بہترین شاعری قرار دیتے ہیں۔ نثری نظم کی نئی ساخت، اوقاف کا استعمال نئے الفاظ کی کھوج، نئی تراکیب کی لگن اور نظموں میں تیزی سے بدلتے ہوئے منظر ناموں کو ایک استعاراتی وسعت سے ہمکنار کرتی ہیں۔ ان نظموں پر راں بو، سینٹ جان پرس اور دیگر فرانسیسی شعرا کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ ان نظموں کی زیادہ تر تشکیل الجزائر میں ہوئی جہاں مصنف نے سرکاری مصروفیت کے باعث دو سال کا عرصہ گذارا۔

وطن سے دوری کے باعث شاعر نے قومی اجتماعی شناخت اور ثقافتی ورثوں کی موجودگی کے اعتماد کا تجربہ کیا، اساطیری تلازمات کی معنوی توسیع سے ایک نئی دنیا بنانا اور پھر اس میں جنگ نامے کی فضا پیدا کرنا مرثیے اور رزمیے کی جانب مراجعت ہے۔

عبدالرشید کا خیال ہے۔

''نوحے، تیسری دنیا کے ایسے اشخاص کی کہانی ہے جو اپنی شناخت اور وطن گم کر چکے

اور جدو جہد میں اپنی جڑیں تلاش کرنے کے عمل سے گذر رہے ہیں۔"

اس کتاب میں انیس ناگی نے اپنے ہمزاد کی موجودگی کے ہاتھ پر بیعت کی ہے۔ اپنی ہی شخصیت کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا عمل تو بہت دیر سے جاری تھا لیکن پہلی مرتبہ دونوں اکائیاں اپنی اپنی وحدت کے ساتھ ایک دوسرے پر حملہ آور ہوئی ہیں۔

وہ میری قید میں ہے
اور میں اس کی دیواروں میں ہوں
وہ مجھ کو سزائیں دیتا ہے
میں اس کو ساری رات جگاتا ہوں
کبھی وہ خواہش بن کر دل کے ڈھول بجاتا ہے
کبھی وہ موت سے ڈر کر مجھے سزائیں دیتا ہے
اور ساری رات میری سوچ کا رستہ روکتا ہے
ساری رات میں گھور اندھیرے میں غائب کی کھوج لگاتا ہوں
☆☆☆☆☆
پھر میں سوجھی جلتی سرخ خمار آلود آنکھیں لے کر
صبح سویرے اس کو اپنے بستر پر لے آتا ہوں

(دو قیدی، ص145)

اپنی ذات کی دریافت کے ان لمحوں میں نشے کی ایک ترنگ بھی شامل ہے۔ اس کتاب میں اٹھارہ نوحے شامل ہیں۔ آخری نوحے میں شاعر نے لکھا ہے۔

"وہ عدم گویائی، وہ علیحدگی، وہ احساس کمتری، جو اجنبی سرزمینوں میں بھی ہمارے بوالہوسانہ تعاقب میں تھا ایک عرصے سے، ایک چیل تن کی طرح ہمارے اعصاب کو، ایک قصاب کی طرح ہمارے عضو عضو کو، ایک معلم کی طرح ہماری سوچ کے ہر ریشہ کو شکستہ کر رہا ہے۔۔۔۔۔ اور اہم ازلی اجنبیت کا مقسم لئے، اپنی اولاد کے بے ثمر زمانے کا مژدہ

دیتے ہوئے، ایک کھوئی ہوئی صدا کی طرح تمام موسموں میں، تمام عارضی سلطنتوں کے راستے سے گذرتے ہوئے، زیرِ لب آخری نوحے میں ڈھلتے جا رہے ہیں"۔

(ص174-175)

"نوحے" نو آبادیاتی نظام حیات کی تصویروں سے معرضِ وجود میں آئے ہیں۔ ان نظموں کا پیرایہ اظہار طویل گفتگو اور اشارات سے مرتب ہو کر قاری تک پہنچتا ہے۔ اس کتاب کا شاعر ہمیشہ سے طبقاتی تقسیم اور طبقاتی شعور کا جبر سہتا رہتا ہے لیکن یہ جبر صرف ذاتی یا گروہی نہیں بلکہ وسیع پیمانے پر اسے تاریخیت کے جبر سے جوڑا جا سکتا ہے۔

بقول تبسم کاشمیری

"نوحے" میں محکوم اور پسماندہ نسلوں کا وسیع لینڈ اسکیپ ابھرتا ہے۔۔۔ تیسری دنیا کی سرزمینوں پر رینگتا ہوا انسانی آشوب شاعر کو اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے یوں لگتا ہے کہ جیسے وہ بڑی بلندی سے ایتھرز دہ فضاؤں میں اپنے نیچے براعظموں کی عظیم وسعتوں کو دیکھتا ہے۔۔۔ شہروں میں بننے والی نئی معروضیت اور وجودی کشمکش اس کے جسم کو ایک لمحے میں توڑ پھوڑ دیتی ہے اور پھر ایک ہی لمحے میں وہ توانا شخصیت میں بدلتا ہے، توڑ پھوڑ کا یہ عمل ان ساری نظموں میں جاری ملتا ہے،" نوحے کی ان نظموں میں نیا انسان طلوع ہوتا ہے۔"

نوحے کی نظموں کا شاعر بیک وقت روشنی، اندھیرے اور دھندلاہٹ کا اسیر ہے اور وہ خود اپنی اس کتاب کے بارے میں لکھتا ہے۔

"یہ نظمیں میرے لئے اس لئے بھی زیادہ اہم ہیں کہ ان کے حوالے سے میں نے ایک نئی انسانی معروضیت کو دریافت کیا ہے، تمام نظمیں ایک محکوم اور پسماندہ نسل کے نوحے ہیں جو ایک اجنبی سرزمین پر لکھے گئے ہیں لیکن پسماندہ سرزمینیں ایک سی ہیں اور ان میں رواں مسائل بھی ایک جیسے ہیں۔"

اس شعری واردات میں یوں لگتا ہے جیسے ہزاروں مناظر اور اشکال بڑی تیزی سے آنکھوں

کے سامنے گذرتی چلی جاتی ہیں، اس منظرنامے کا ایک دروازہ سمندر کی طرف اور دوسرا خاکستری تیرگی کی جانب کھلتا ہے۔

بقول شاعر

''ہمیں یاد ہے کہ ان شہروں میں، ان شہروں کے مدرسوں میں، ہمارے کلام نے فضیلت پائی، لیکن معیشت کی تنگی نے ہمارے لئے رسوائی کمائی اور دل برداشتگی نے ہمیں مہاجر بنایا۔ (ص 163)

ہم پوچھتے ہیں کہ یہ مسلسل اضطراب کب ہمارے لئے ایک نئی انسانی معنویت کا، ایک ہمہ گیر حکمت کا اور ایک نئی جستجو کا اشارہ ہوگا۔ (ص 171)

ان نظموں کو پڑھ کر اسی عظمتِ رفتہ کا خیال آتا ہے جسے اقبالؒ کی شاعری میں ''شوکتِ پاستان'' کا درجہ دیا گیا ہے۔

زرد آسمان :

انیس ناگی نے اس کتاب کا سنِ اشاعت 1979 درج کیا ہے۔ اس مجموعے کی پہلی نظم کا نام ''یرقان'' رکھا گیا ہے۔ نظم کا اسٹرکچر اور استعاراتی رویہ وہی ہے جو ''نوحے'' میں دکھائی دے رہا تھا۔ اگلی نظم رات، ایک ناؤ بھی لاشہریت کے انتشار، بدن کی ناگفتہ بہ حاجتوں کے اصرار اور زوال کے آخری لمحات کی عکاس ہے۔ تیسری نظم میں شاعر اپنے سفر سے مراجعت پکڑتا ہے۔

میں حیاتِ مہمل کی جستجو میں
سفر زمانے کا کر چکا ہوں
میں فاتح کی طرح چلا تھا
جو راستے میں مجھے ملے تھے
وہ تیغ میری سے کٹ گئے تھے
میں زائروں کے لباس میں

قرضِ خوں بہا کا اتار نے سرمنڈا کے یونہی نکل گیا تھا

کہ لوٹ آؤں گا ایک دن

پھر بتاؤں گا حیاتِ مہمل کا راز کیا ہے

''زرد آسمان'' انیس ناگی کے وجودی رویے کو باقاعدہ طور پر ہمارے سامنے لاتی ہے۔ ''میں اور وہ'' میں ایک جگہ مصنف نے لکھا ہے۔

''میرا وجود میرا شعور ہے اور میرا شعور مری سزا ہے۔''

یہ ہی ہیرو ہے جو پاکستان چھوڑ کر ایک معروف انقلابی ملک الجزائر گیا تھا اور وہاں اٹھارہ نوحے لکھنے کے بعد جب اپنی سرزمین پر آتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے۔

''زمین کا گنبد تقسیم ہو چکا ہے طول بلد اور عرض بلد کی لکیریں اس تقسیم کی دلیل ہیں۔ کوئی کسی کو اپنی سرزمین پر رہنے کا حق نہیں دیتا اور میرے لئے تو میری اپنی سرزمین پر بھی رہنا محال کر دیا گیا ہے۔''

غلامانہ فیبرک سے بنائی گئی یہ نظمیں جن کا شاعر سرمنڈا نے کے لئے اپنے آپ کو پابلو نرودا بھی سمجھ رہا ہے اور دانش ور بھکشو بھی اپنے لئے ایک تیر کا انتخاب کرتا ہے، کیونکہ ترکش میں ایک ہی تیر بچا ہے۔

رفتہ رفتہ سب آوازیں

جو دل کے اندر ہیں

اور باہر

اک ایسے سکتے میں کھو جائیں گی

مفہوم ابھی تک جس کا

کسی لغت میں ملا نہیں ہے۔'' (مدفون پرانا شہر 194)

یہیں شاعر کو اپنے خوابوں کا، اپنی امید کا شہر بے بنیاد لگتا ہے۔

''اوہ! اے شہرِ بے ثبات، اوہ اے شہرِ بے بنیاد! تیرے ہی در و دیوار کے درمیان،

ایک شہرِ آئندہ کو اپنی پیشانی کی سکڑی ہوئی لکیروں میں لئے ہوئے، اک بے بس غلام کا صبر لئے ہوئے، اندھی میلی کچیلی سڑکوں پر سورج کے ساتھ چلتے ہوئے، اپنی عمر کے سائے کو ڈھلتے ہوئے دیکھتے اسی سوچ میں گم رہے کہ جنہوں نے ہمیں جنم دے کر ایک بے ایمان کشمکش زندگی کے سپرد کیا، ان کی تربتیں بھی غموں سے بوجھل ہو چکیں۔"

اس شاعری کا عصری منظر نامہ ایک جانب تو لاتعلقی اور عدم وجودیت سے بندھا ہوا ہے اور دوسری طرف اس میں ہم پاکستانی سیاست کے کئی خدوخال دیکھ سکتے ہیں۔

شاعر کی جذباتی حالت، اس کے اشتباہات، شعری تلازموں کا بہاؤ کسی قسم کی خوبصورتی کا غماز نہیں بلکہ ان نظموں میں موت کی ایک زردی چھائی ہے، زرد آسمان میں دھند آوازوں کا راستہ روک رہی ہے اور انسان ایندھن کی طرح سرد ہوتے جاتے ہیں، تیرگی کا تضاد شاعر کو ایک پتھر میں تبدیل کرتا ہے۔ وہ اعتراف کرتا ہے کہ وہ ایک خوف زدہ نسل کا باشندہ ہے۔ اس کا وجود تساہل کی علامت ہے اور وہ اختلاف کے عذاب دائمی میں مبتلا ہے۔

روشنیاں :

یہ کتاب 1984 میں منصۂ شہود پر آئی۔ دراصل اس کتاب میں فرد کے اضطراب اور اضطراب کے محرکات کو شاعری کا موضوع بنایا گیا ہے۔ جسمانی، نفسیاتی اور انسانی معاملات ایک دوسرے میں اس طرح کھو گئے ہیں کہ فرد کی ذات مرکب العناصر ہو کر ایک لامتناہی وحدت میں ڈھل گئی ہے۔ خوف کی حالت میں انسانی زندگی کے بے ثباتی اور خواہش کی ناآسودگی کے پیشِ نظر شاعر پہلی نظم میں ہی سوال کرتا ہے۔

میں سرد مہر زندگی سے کیا طلب کروں
طلب تو ایک بحر ہے
یہ زندگی تو سانس کی لپکتی ایک لہر ہے
کہ وقت کا سفر گھڑی میں قید ہے

دوسروں کی خواہشوں کے گرد رقص کرتی زندگی نے

کیا دیا مجھے

طرح طرح کے عارضے، دماغ کا بخار

اختلال اور حواس کے شعور کا ملال۔ (شاخ عمر، ص 210)

انیس ناگی کی دفتری زندگی کی کئی بے اعتنائیاں فیصلے کے انتظار میں ذات کی عظیم سلطنت کو آگ میں لپیٹتی ہیں، رات کا ابہام چہروں اور کتابوں کو اپنی دھند سے گدلا دیتا ہے اور یہیں شاعر کو احساس ہوتا ہے کہ شعر اس کی دسترس سے باہر جا رہے ہیں۔

خود مرے حواس کی حدود سے نکل گئی

شاعری جو لفظ لفظ میرے خوں میں تھی

مجھے فراق کی طویل ساعتوں میں چھوڑ کر

نہ جانے کس طرح چلی گئی ہے (شاعری سزا، ص 215)

ناسلٹجیا اپنی جڑیں مضبوط کرتا ہے

سوچتا ہوں کدھر صبح کا راستہ ہے

مگر میری تھکتی ہوئی سوچ میں

اپنے ہونے کی دیوانگی ہے (ص 222)

اس کتاب میں اگرچہ دورۂ جاپان کے تحت لکھی گئی ہائیکو، ٹوکیو میں آدھی رات، ایک جاپانی لڑکی کے لئے جیسی نظمیں بھی موجود ہیں، لیکن انیس ناگی کی شاعری کا بنیادی کینوس پرندوں سے بے آباد شہری ہے۔ شاعر اب گوتم بدھ کے رستے پر چلنا چاہتا ہے۔

''میں نے عورتوں اور بکریوں کو رسم کی قربان گاہوں پر

خمیدہ سر، چتا میں جلتے دیکھا

دفتروں میں مطلبی اور دو لسانی افسروں کو

اہل کاروں کو بگڑتے دیکھ کر

چپ چاپ میں نے جنگلوں کی راہ لی (ص 230)

یہی خیال مزید جڑ پکڑتا ہے

جی میں آتا ہے

کہ درویشی کے رستے پہ نکل جاؤں

زندگی کے ضابطوں کو توڑ دوں

شرم و حیا کی الجھنوں کو نوچ دوں

سب خانگی جھگڑوں کو کھانے کی ٹرالی پر

ادھورا چھوڑ کر

ارضی خداؤں کے تحکم، اہلِ زر کے دبدبے سے ایک لمحے کے لئے

آزاد ہو کر

ہاتھ میں سگریٹ لئے

چپ چاپ سارا دن

گلی کوچوں میں بکھری خاک پر چلتا رہوں (ایک اچانک خیال، ص232)

انیس ناگی نے لکھا ہے

"یہ کہنا کہ آوارہ گردی بے مقصدی کی علامت ہے، ایک ذہنی مغالطہ ہے اور ایک غلط معیار کی اطاعت کا نتیجہ ہے کیونکہ ہم ہر انسانی فعل کو اس کی مادی منفعت یا نقصان کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔ شاعر کے حوالے سے آوارہ گردی تجسس کے ذریعے اپنے آپ اور اپنے اردگرد کی کائنات کے ادراک اور افہام کا وظیفہ ہے۔ ایک شاعر اس وقت اپنے بند کمرے سے اکتا کر یک دم آوارہ گردی کے لئے نکلتا ہے جب اس کی ذات اس کے لئے معانی سے عاری ہو جاتی ہے جب وہ اپنی ذات کی بے مقصد حاکیت کو قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے اور اپنی ذات کو محو کرنے کے لئے وہ دوسری اشیاء اور مظاہر کے درمیان قدم رکھتا ہے۔ اس اعتبار سے آوارہ گردی ایک صوفیانہ فعل ہے"۔

(شاعر اور آوارہ گردی تشکیلات، ص33)

اس صوفیانہ عمل کے ساتھ زیر مطالعہ اس کتاب میں غزل اور غزل گو شعرا کے بارے میں بھی انیس ناگی کے خیالات نظم ''مرا نقاد'' میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اسی کتاب میں شاعر اپنے وجود، اپنے نام اور اپنی شناخت کے بارے میں سماجی بندشوں سے نجات کا متمنی ہے۔

میرا نام غلام تمہارا
میرا نام مجھے لوٹا دو
جس رنگ میں چاہا
میرا نام پکارا تم نے

☆☆☆☆☆

ہم دونوں کٹہرے میں ہیں
دکھ درد گواہی میری
میری ذات اندھیرے میں ہے
میرا نام مجھے لوٹا دو۔۔۔ (ص241)

نجات دہندہ کون ہے اور جبر و اکراہ کی یہ کیفیت کسی رومان کا پیش خیمہ ہے یا زیر لب سیاسی و سماجی احتجاج کتاب زندگی پر صرف ایک لفظ لکھا ہے۔ اور وہ ہے احتجاج و اختلاف۔

یہیں ایک مختصر نظم دکھائی دیتی ہے۔

موم بتی کی چمکتی روشنی میں
سامنے دیوار پر
اس کا شکن آلود چہرہ کانپتا ہے (ایک تصویر، ص249)

کچھ دوسرے لینڈ سکیپ بھی کائی زدہ ٹوٹے پھوٹے چوکور مکانوں کی تصویر دکھاتے ہوئے سڑک کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں، ایک اجنبی روشنیوں کے شہر سے چپ چاپ گذرتا ہے اور بے خوابی کے شہر میں داخل ہوتا ہے۔

بے خوابی کی نظمیں:

یہ کتاب جمالیات نے 1987 میں شائع کی۔ کتاب کی بیشتر نظمیں تین طرح کے احساسات کو اجاگر کرتی ہیں۔ ایک احساس تو صنعتی نظام کی تیز رفتاری سے ابھرا ہے جہاں ہر سمت دھول ڈراتی ہوا کائنات کی ہر شے پر قدم رکھتی ہوئی تیزی سے سفر کر رہی ہے اور انسانی قدم اور انسانی وقت کائناتی گردشوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں، دوسرا احساس پرانے لفظوں کی گمشدگی اور نئے الفاظ کی تلاش اور انتخاب ہے۔

"اب ہم نئی ابجد سے مسلح ہو کر اسی جہاں سے روبرو ہیں جس میں ہمارے لفظوں کی ضیافت بے معنی ہو چکی ہے۔ جہاں ہمارے تکلم کو ایک ضعیف العقل کی بڑبڑاہٹ سمجھ کو معانی سے محروم کرنے کی سازش کی گئی ہے کہ ہم اپنے لفظ سے، اپنے مدعا سے، اور اپنے آپ سے محروم ہو کر اپنی ہی سرزمین پر جلاوطنی کے شب و روز بسر کرتے ہوئے، ایک ایسی تاریخ کے نوحہ گر بن جائیں تو اب ہماری دسترس سے باہر شب و روز کے تانے بانے سے مرتب ہو چکی ہے"۔

(لفظوں کی ضیافت، ص291)

تیسرا احساس صبر و سکون کی عدم موجودگی، بے مصرف مصروفیت اور بے خوابی کا ہے، رات اور اس کے متعلقات ان نظموں میں وحشت، بے اطمینانی اور اداسی کے استعارے ترتیب دیتے ہیں، ایک لمبی رات، پریشاں رات، ایک بکھرا ذہن، مجھے جاگنا ہے، رات کا پرندہ، بے خوابی کی تمثیل، رات کا صحرا، بے خواب رات، شعلہ، رات اور آسماں اور بے خوابی کا خواب ایسی ہی نظمیں ہیں۔

میں پرندہ رات کا ہوں
کائناتی تیرگی کی شاخ پہ بیٹھا ہوا
پچھلے پہر کی نیند میں مدہوش لوگوں کو جگاتا ہوں

انہیں میں فکرِ فردا سے ڈراتا ہوں (ص279)

☆☆☆☆☆

کون میری طرح رات بھر جاگتا ہی رہے گا

تصور کی دنیا میں کھویا ہوا لڑکھڑاتا رہے گا

☆☆☆☆☆

کون سی ذات ہے جو مری ذات ہے

مگر ماورا ہے

مجھے جس نے اک اضطرابِ مسلسل دیا ہے (ص281)

☆☆☆☆☆

یہ بے خواب راتوں کی بنجر زمیں

دور تک تیرگی تیرگی ہے

☆☆☆☆☆

وہ سب خواب

جو میں نے بے خواب راتوں میں دیکھے

وہ آدرش جو دفتری میز پر کام کرتے ہوئے کھو گئے

میں انہیں بھول جاؤں

☆☆☆☆☆

ہوا تنکا ہے

نہیں وہ پرندہ ہے

جو اپنا سر آئینے سے پٹخ کر

کسی داستاں کے ورق پر گرا ہے (ص302-303)

ذات کی دریافت اور پھر کائنات کی وحدت میں اپنی موجودگی کا احساس نا گ کی شعری دنیا میں مسلسل توڑ پھوڑ کا عمل ہے۔ ایک کی صورتِ احوال بے خوابی کی راتوں سے گذر کر ایک ایسے آشوب کو جنم دیتی ہے جو جدید مواصلاتی نظام کی سب آسودگیوں کی نفی کرتا ہے۔ یہ ماحولیاتی کیفیت قومی سطح پر ہو یا بین الاقوامی سطح پر مروجہ نظام زندگی کے روابط کو بے ذائقہ کرتی ہے۔ یہ

ڈیکارٹ کا رُکا ہوا وقت نہیں اور نہ ہی زمان و مکاں کے برگسانی تصور کی رومانیت ہے، یہاں پرانی ڈکشنریوں میں بھرے لفظ، انسان، نیکی بدی کے تصورات خالی بوتلوں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔

خواب دیکھنے اور جاگتے رہنے کی اذیت میں گھرا ہوا شاعر کہتا ہے۔

سوچنے کے لئے کچھ نہیں ہے
بہت دیر سے گنبدِ ذہن میں
ذات کی الجھنیں
خوف ہی خوف
نامہرباں عہد کی سختیوں کا لرزتا ہوا شور
جس میں مزہ زندگی کا
لڑھکتے ہوئے گیند کی طرح اس شہر کی سیڑھیوں پر
کہیں کھو گیا ہے
رات بھر جاگنے کی سکت بھی نہیں ہے
کہ میں حوصلہ کھو چکا ہوں۔ (ص 258-259)

آگ ہی آگ:

یہ کتاب 1989 میں جمالیات نے شائع کی۔ جدید شاعری جو اپنے آپ کو بغاوت کا منشور سمجھتی ہے بتدریج اس کے علامتی اشارے روزمرہ کی زندگی کے نئے پرانے جھوٹ کی آسانی سے قبول کرنے لگے ہیں۔ البتہ بغاوت کا لازمی نتیجہ جو اضطراب اور ہیجان شاعرانہ آہنگ کی حدوں سے باہر جھلکنے میں ہی عافیت محسوس کرتا ہے، اس دیوانگی کے باعث شعری محاکات کی شکست وریخت اور صوتیاتی نظام کی متشدد حرکات شاعرانہ عمل میں نفی کی صلاحیت کو زیادہ اجاگر کرتی ہیں۔

ہمارے گھر میں
نہ پھول کوئی نہ بیل ایسی

کہ جس پہ کوئی پرندہ بیٹھا

ہمیں سنائے وہ گیت جس سے

ہمارے ذہنوں میں وسعتوں کا خیال جاگے

یہیں انیس ناگی کی شاعری میں اصلاح کی کیفیت جاگتی ہے۔ (ص344) .

ہمارے باطن کی ایک تلخی سے

شہر سارا بگڑ گیا ہے

جدھر ہی دیکھو

تاجرانہ سی سنگدلی نے

سلوکِ مہر و وفا کو ہم سے اُچک لیا ہے (ص348)

اضمحلال اور بیگانگی کی کیفیت کے ساتھ ہی ساتھ سرد مہری کے جذبات بھی ابھرے ہیں۔

فضا میں ایسا جمود ٹھہرا

درخت گم سم

نہ پیرہن میں ہے سرسراہٹ

نہ دل میں ہے اب ملال کوئی

نہ کوئی رغبت ہے زندگی کی نفاستوں سے (ص351)

اس فضا کی تصویر بہت ساری نظموں کے کینوس پر پھیلی ہے، چہروں کی بے ترتیب قطاروں میں نہ موسم کا کوئی رنگ ہے نہ لہجے کی کوئی نرمی، ایک کھنڈر کی ویرانی ہے اور ایک دکھ ہے جس کی موجودگی میں شاعر ان لوگوں کے لئے افسردہ ہے جو اپنی ذات کو منا کر وقت کے غلام بن گئے ہیں۔

اس کتاب میں اپنی سرگذشت کی طرح شاعر کو کتابی شعر بھی دکھ درد، ہزیمت اور شکستہ آرزوؤں کے خوف سے بوجھل دکھائی دیتی ہے۔

''میں بندگی اور زندگی کے درمیاں چلتا رہا

احساس کا شعلہ مرا

جلتا رہا بجھتا رہا" (ص336)

اسی خیال کو دوسری نظم میں دوہرایا گیا ہے، آرزو اور شاعری کتاب شعر کو ملبہ بنا کر گذر گئی ہیں۔

شاعر نے اپنی ذات اور نام کی نفی آغاز شاعری میں کر دی تھی اور زندگی کو ایک مفروضے کی طرح بسر کرنے کا فیصلہ کیا تھا، یہ مفروضہ ہمارے متوسط طبقے کے ذہین اور پڑھے لکھے نوجوانوں کی انفرادیت پسندی کے گرد گھومتا ہے، یہ انفرادیت پسندی داخلیت اور تنہائی کے اشتراک سے اکثر اوقات ایک شک آمیز سرد مہری میں تبدیل ہوتی ہے۔

یہ نام سارے تو ایک سے ہیں
میں نام اپنا بتا بھی دوں
تو ہمارے رشتے میں فرق کوئی نہیں پڑے گا

یہ نام میرا
یہ پھول میری شناخت کل جو بنا ہوا تھا
ہجوم میں کوٹ سے اُچھل کر
کسی روش پر یا تیز چلتے قدم کے نیچے
شکستہ ہو کر کہیں گرا ہے
وہ بوجھ تھا جو اُتر گیا ہے
میں ایک سایہ ہوں
زندگی کی تماشا گاہ میں۔ (ص342)

ابھی کچھ اور :

اس کتاب کو 1990 میں جمالیات نے شائع کیا۔ اس کتاب میں شاعر کے تجربے ایک خاص رجحان کی سمت اشارہ دیتے ہیں، ہم اس رجحان کو جمود اور سکوت کے ساتھ ساتھ تجربے کی تکرار کا نام بھی دے سکتے ہیں، ان نظموں میں شاعری کے زیادہ تر امیجز آسمان، چھت اور دریچوں سے وابستہ ہیں۔

دن تو ایک پرندہ تھا
جو پھڑ پھڑاتا ہوا کسی شہر کے گلی کوچوں میں جا گرا تھا
اور میں ایک شکاری کی طرح دور بین لئے
چھت پر ہاتھ اٹھا کر
پرندوں کے غول میں اسے دیکھ رہا تھا (ص350)

☆☆☆☆☆

ہماری زندگی بے کیف سی تکرار ہے
ہر روز وہی بات ہے
ہر روز وہی لوگ ہیں
ہر روز وہی راستہ ہے
جس پہ چلتے چلتے کتنے تھک گئے ہیں
ذہن بھی ہر بات سے اکتا گیا ہے
اور سمجھ موقوف ہے

☆☆☆☆☆

ہمارے لئے یہ زمیں ہے
آسماں ایک سکڑا ہوا دائرہ ہے
جسے دیکھتے دیکھتے ذہن شل ہو چکا ہے
بصارت بھی پتھرا گئی ہے
اور زمیں ایک کمرے کے اندر ہی محدود ہے
جس میں چلتے ہوئے ایڑیاں گھس گئی ہیں (ص370)

پیہم خلفشار کے باوجود نہ بے اعتمادی کی الجھن میں کمی آتی ہے نہ اس تاریخ اور وقت کے دائرے سے نکل سکتا ہے، اس مخصوص اور محدود فضا میں ایک اور استعارہ جنم لیتا ہے۔

''اور ہماری وراثت میں ایک شکستہ گملا تھا'' (ص373)

شاعر کی سوچ کا رستہ کسی نے کاٹ دیا ہے وہ شور و شغف کی دنیا میں خلقِ خدا کے درمیان کھڑا راستے کی دیواریں دیکھ رہا ہے، لفظ گم ہو گئے ہیں اور گفتگو کا نیا پیرایہ تلاش کیا جا رہا ہے۔

''اب ہمارا تکلم اشاروں میں ہے
عمر بھر لفظ کی رہنمائی میں ہم
ذات کی سیڑھیوں سے اترتے رہے ہیں
کبھی دوسرے کو خود اپنا ہی سایہ سمجھ کر
کبھی اپنے سائے میں وہ دوسرا ڈھونڈتے ہیں'' (ص377)

سائے کی ہمسائیگی یادوں کے سمندر میں ابھرتی اور ڈوبتی ہے اور شاعر ایک پریشان رات میں اپنے آپ سے ایک سوال کرتا ہے

''مرے پاس کوئی نہ راستہ
مرے ہونٹ پر نہ کوئی دعا
مرا دل ہے شک سے بھرا ہوا
مری خاک کا ہے قصور کیا
کہ مری حیات مراد کوئی نہ پا سکی؟ (ص382)

اگلی نظم میں یہ بدمزگی اور بڑھتی ہے

مری نیند کیسے اجڑ گئی
مرے خواب سارے کدھر گئے
مرا ذائقہ بھی بدل گیا
میں معالجوں کے مطب گیا
کبھی صوفیوں کے میں گھر گیا
یہی پوچھنے کہ بدن میں میرے جو آگ تھی
وہ شعور تھا یا عذاب تھا (ص384)

اس مجموعے میں ایک نظم گھر واپسی کے ساتھ دائروں اور لکیروں سے گھر کا ایک علامتی نقشہ بنایا گیا ہے جس کے نیچے یہ نظم درج ہے۔

میں اس گھر کو واپس کیسے جاؤں؟

چاروں سمت اندھیرا ہے

اور وقت کا پہرہ گہرا ہے

وقت جوانی اور بڑھاپا رستہ روکے کھانس رہے ہیں

کوئی کہتا ہے خواب میں رستہ ملتا ہے

لیکن میرے خواب بھیانک ہیں

میں جیون بھر بھٹکا ہوں

اب خوابوں میں بھی بھٹکوں گا

شاید اپنے گھر تک پہنچوں (ص318)

اس موضوع کی ایک نظم صفحہ 387 پر ملتی ہے۔ مراجعت کی یہ خواہش ایک صوفیانہ تصور کو اجاگر کرتی ہے، کیا شاعر اپنے معاشرتی نظام کے توسط سے اپنے اعصابی نظام کی پیچیدگیوں تک پہنچ سکتا ہے۔ کیا وہ اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ اس کی زندگی ہمیشہ سے احساسِ جبریت کی مرہون منت رہی ہے، کیا وہ تبدیلی کی خواہش سے آگے نکل کر سنگِ گراں ہٹانے کی ہمت رکھتا ہے، جدید شاعر سے یہ سوالات شاید بروقت نہ ہوں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ زندگی کے بیسویں برس میں شاعری کا آغاز کرنے والا شاعر تیس برس کے بعد بھی شاعرانہ اضطراب کی ناآسودگی کے چنگل سے آزاد نہیں ہو سکا۔

بے خیالی میں:

اکتیس نظموں کا یہ مجموعہ 1992 میں جمالیات نے شائع کیا۔ شاعر نے اپنی اس کتاب کے دیباچے میں لکھا۔

"بے خیالی میں میرا نواں شعری مجموعہ ہے، ایک مخالفانہ شعری روایت میں آزاد نظم یا نثری نظم لکھنا ایک طرح کا جہاد ہے، جہاد خواہ ذات کے اندر کا ہو یا باہر، یہ شاعری کے فروغ کے لئے ضروری ہے۔۔۔۔ میں اپنی نظموں کا خود ہی دیباچہ نہیں لکھنا چاہتا کہ مبہم اور مرصع قسم کی نثر لکھ کر اپنے قارئین کے لئے ان نظموں کے افہام کا در بند کردوں، ہر نظم بذاتِ خود ایک وضاحت ہوتی ہے اس سیاق و سباق کی جس سے وہ جنم لیتی ہے۔۔۔ ہر موقف اپنی وضاحت چاہتا ہے ہر شاعر نے اپنا عصری موقف خود متعین کرنا ہے بصورت دیگر اس کی شاعری نجی واردات بن کر رہ جاتی ہے، چنانچہ ضروری ہے کہ شاعر اپنے موقف کو اس عصریت سے اخذ کرے جس سے وہ شعری ابہام لیتا ہے۔"

اس کتاب کا انتساب بھی ملاحظہ کیجئے۔

ان کے نام..........

"جنہوں نے مجھے رد کیا

جنہوں نے میرا تمسخر اڑایا، جنہوں نے میرے لئے زندگی مشکل بنائی

جنہوں نے مجھ کو مجھ سے چھین لیا

اور دیر تک سگاروں کے دھوئیں کے عقب سے

میرے اضطراب کا تماشا دیکھتے رہے۔"

ابہام کی خوش گمانی، عصریت سے انسلاک اور دشمنوں کی طویل فہرست کی موجودگی میں شاعر موت کے اضطراب، بے زاری و سراسیمگی اور احساسِ زیاں کے ساتھ بے خیالی کی سلطنت میں داخل ہوتا ہے۔

زندگی بے ثمر ہے اور بے کیف ہے

آگ کا دائرہ ہے

کہ جس میں کھڑے جنگ کرتے ہوئے ساتھ ان کا دیا تھا

جنہوں نے ہمیں آگ کے دائرے کی سزا دی

کہ ہم سوزشِ دائمی میں وہ سب ذائقے بھول جائیں

کوئی خواب دیکھیں نہ تعبیر کی جستجو میں قیافے لگائیں

نہ خوش حال خطوں سے تازہ خیالوں کی کچھ بھیک لائیں (نیا ورلڈ آرڈر، ص18)

عصری تصادمات میں دوسرے نیم ترقی پذیر ممالک کی طرح پاکستان کو بھی مالیاتی قرضہ بندی کے منشور نے کافی نقصان پہنچایا ہے، وہ جو کہا جاتا ہے کہ فقیر فقراء کو انتخاب کا حق نہیں تو یہی کیفیت پاکستانی انقلاب پرستوں کی ہوئی۔ زندگی کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں نے انا پرستی پر وہ کاری ضرب لگائی کہ سب نظریات دھرے کے دھرے رہ گئے۔

نہ دایاں بازو

نہ بایاں بازو

مجھے خرید و کہ ہوں حاضر

میں بے وفا ہوں

مجھے خرید و کہ وقت میں ہوں (مجھے خریدو، ص21)

جہالت کا بول بالا ہوا ہے، شاعری بے منصب ہوئی ہے، امن کے پرندے گولیوں کی بوچھاڑ سے صرف پروں میں تبدیل ہو رہے ہیں، بے حسی کے راستے پر سفر کرتا ہوا اکیلا رہ جانے والا آدمی کہتا ہے۔

"بے حسی کی زندگی میں شانتی ہے

جو یقیناً اتفاقی حادثہ ہے۔" (ص36)

وقت کے اسیر وفاداریاں بدلتے ہوئے لوگ اپنی موجودگی کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں، ہر طرف ایک ابتری کا سماں ہے، نہ انتظارِ سحر، نہ انصاف کی جستجو، آسمان کا ورق ستاروں سے خالی پڑا ہے دل کی دنیا تعلقات کی کثافت سے اٹی پڑی ہے، لوگ لفظ کی پہچان سے محروم ہیں۔

پرندوں کی عبارت کے شکستہ پر آئندہ زمانے کی پرواز کی خواہش اک اک کر کے زمین پر

۔تے چلے آرہے ہیں، بے خیالی گمشدگی کا اعلان کر رہی ہے، مظلوم آدمی بے زماں اور بے
ماں ہے، خوف کی دہشت اور تھرتھراہٹ ہے جو اس قدر بڑھ گئی ہے کہ لوگ وقت کی موجودگی
ے بے نیاز ہونا چاہتے ہیں۔

کبھی رات کا خوف ہے
کبھی ذات کا خوف ہے
کبھی موت کا خوف ہے
کبھی خوف کا خوف ہے
ہمارے لئے بس یہی زندگی ہے
ہم نے گھڑی باندھنی چھوڑ دی ہے

(ص 461)

شاعر اس خوف کی ہراسانی سے بچنے کے نیند کی گولی کھاتا ہے اور سوجاتا ہے۔ کبھی کبھی پیچھے مڑ کر
دیکھنا ایک اور تکلیف دہ عمل ہے، تلاشِ مسلسل ہر قوم کا مسئلہ ہے۔

بظاہر تو میں اہل کاروں کی صف میں کھڑا ہوں
مگر عہدِ حاضر کے بحران کی ایک تاریخ ہوں (ص 467)

تشکیک کا مرحلہ آتا پہنچا ہے اور شاعر کہتا ہے

میں زوالِ عمر میں چلتا ہوا ان راستوں کو ڈھونڈتا ہوں
"جو کہیں جاتے نہیں آتے نہیں
سلطنت میں لوگ مجھ کو جانتے ہیں
پر مری پہچان سے منکر ہیں کیوں؟
تشکیک منزل فلسفے کی
تصوف سے نکلتا راستہ ہے" (ص 471-472)

شاعر محسوس کرتا ہے کہ اس نے تجارت کرنے والوں اور حساب کتاب رکھنے والے لوگوں کے

.رمیان اپنا جنم ضائع کیا ہے، یہیں وہ اپنی شہرت سے بھی گریزاں ہے اور اپنی موجودگی سے بھی،
اس کتاب میں اس نے ''کمی کمین، کمینی ذات'' جیسی اصطلاحیں بھی استعمال کی ہیں۔

''نہ سائلوں میں نہ عاشقوں میں نہ حکمرانوں میں نام میرا
کسی رجسٹر میں تم کو شاید نہیں ملے گا
کہ نام کی یہ لوح چند حرفوں کا طوق جس کا
نہ کوئی معنی نہ کوئی رشتہ ہے زندگی ہے
عجیب الجھن ہے کہ لوگ مجھ کو
اسی حوالے سے جانتے ہیں'' (ص484)

''نام کی مصیبت'' ایک عبوری معاشرے کی مکمل تصویر ہے۔

یوں بھی وہ انگریز کا زمانہ تھا
اور زباں میں غدر بھی ایسا مچا ہوا تھا
وہ لفظ جو ہاتھ میں کسی کے
اچھل کے آیا تھا لے اڑا تھا
میں نامزد ہوں۔۔۔۔اسی لئے میں گھرا ہوا ہوں (ص475)

تشکیک اور سوالات کا یہ گھیراؤ میں وہ ایک خط تحریر کرتا ہے جس میں علم سے دست برداری کا فیصلہ کیا گیا ہے کیونکہ نئے صنعتی عہد میں کتابوں سے زیادہ تحصول سمیٹنے والے عیار ہاتھوں کی ضرورت ہے اور یہیں کہیں وہ رک کر اپنے ملنے جلنے والوں کو بتاتا ہے۔

''میں آدمی کا ظاہری سا روپ ہوں
میں وہ نہیں جو تم مجھے سمجھ رہے ہو Bastered ہوں'' (ص490)

دفتری نظام کی روزمرہ زندگی میں ایک بے ثمر درخت کی وہ قلم کی بے مہر گردش کے سہارے زندگی بسر کرتا ہے اور سوچتا ہے اس بے خیالی کے پیچھے ایک اور بے خیالی چھپی ہوئی ہے۔

بیابانی کا دن:

یہ مجموعہ 1994 میں جمالیات نے شائع کیا۔ مغربی ممالک کی بالادستی اور بین الاقوامی منظر نامے کی تبدیلی کے لئے جونئے نئے طریقے ایجاد کئے ان میں سامراجیت کے خلاف نعرے بازی اور وسیع محاذ آزادی پر رنگ و نسل کے امتیازات مٹانے کی مستقل جنگ بھی شامل تھی، آخر آخر یہ کہا جانے لگا کہ دنیا میں ایک نئی بین الاقوامیت کی بنیاد رکھی جانے والی ہے جو بیسویں صدی کے سیاسی، جغرافیائی اور اقتصادی تقاضوں کو پورا کرے گی اور یہ اشتراک محض جذباتی نہیں بلکہ منطقی اور شعوری ہوگا۔

نئی بین الاقوامیت کی تلاش میں نکلنے والا یہ جدید شاعر جو مروجہ اقدار سے ذہنی بغاوت کا دعویدار ہے، اپنے جذبات اور نفسیات میں انسانی اقدار کی ہمہ وقت تجریدیت کے باوجود اپنی شاعری میں شخصی عدم توجہی اور اجتماعی طاقت کی جبریت کا شکار ہے۔ اس نے اپنی سرگذشت میں اور اپنی شاعری میں نیوراسس کے کافی اشارے دیئے ہیں۔ اس اعصابیت کے نئے مرحلے میں اسے ہر چیز اداس، ویرانی، بے ذائقہ، کڑوی، کسیلی اور بے معنی نظر آتی ہے۔ بشارت کی رات کا "بیمار لڑکا" اس کتاب کے منظر نامے میں "دوزخی باپ" بن کر ظاہر ہوا ہے جسے گھریلو ضرورت مند، سماجی ضرورت مند بار باران ذمہ داریوں کا احساس دلاتے ہیں جو ہمارے جیسے شخصی معاشروں کا المیہ ہیں۔

"ہمیں پتہ ہے کہ زندگی توانا کی جنگوں میں کٹ گئی
منہ دریدہ ہیں لوگ کتنے
یہی کہیں گے کہ باپ آوارہ ہوٹلوں میں یا چاندنی میں
اداس سڑکوں پہ پھر رہا ہے شراب پی کر
کسی تلاش میں ہے
یہ گھر سے بھاگا ہے باپ کیسا
کہ آخرت کا نہ خوف اس کو

گذشتہ نظموں میں شاعر اپنی ذات کے لئے اور شاعری کے لئے پرندے کی علامت استعمال

کرتا رہا ہے۔ یہاں وہی پرندہ کتاب کی شکل اختیار کرتا دکھائی دیتا ہے۔

''کتاب اک پرندہ تھی

جو پھڑ پھڑاتی ہوئی آسماں کی طرف اٹھ گئی ہے

بہت تیز آندھی میں اوراق اس کے پروں کی طرح شہر کے وسط میں

ڈگمگاتے ہوئے، کوڑا کرکٹ غلاظت بھری ٹوکری ہیں

پھسلتے ہوئے، گر رہے ہیں (پرندے کی موت، ص391)

بیابانی اور بے خیالی میں ایک امیج دوسرے امیج میں ڈھلتا ہے، شاعر نے اپنا کینوس تبدیل نہیں کیا وہ یہ منظر نامہ اپنی کھڑکی سے ہی دیکھ رہا ہے، بیابانی کا دن، زرد آسمان، خواہشات کی نا آسودگی اور تعاقب کرتی بدقسمتی اور اسی میں کہیں، بہت ہی مجہول سی معروضیت

جب کمرے سے دل بھر جاتا ہے

تو قہوہ خانے میں آجاتا ہوں

جب قہوہ خانے سے دل بھر جاتا ہے

تو کمرے میں آجاتا ہوں (اندر باہر، ص396)

اس بے دلی اور بے خیالی کی وجوہات شاعر نے خود ہی گنوادی ہیں، کائناتی حسن سے محروم، تحقیر کے ذائقے اور انٹرنیشنل گیٹ وے کا بند کر دیا جانا، یہیں وہ لکھتا ہے۔

''تنہائی کا لفظ مرکب ہے

چند حرفوں کا'' (ص399)

یہ تمام محلاتی سازشیں اور تنہائی جب شہر کی زندگی میں شاعر کا استحصال کرتی ہیں تو وہ راہِ نجات پکڑتا ہے۔

''میں لاحول پڑھ کر پناہ مانگتا ہوں

میں شہرِ خرابی کے دیوارودر سے

میں شہر خرابی میں آباد لوگوں کی تعداد سے بھی

پناہ مانگتا ہوں۔" (ص404)

سماجی رکھ رکھاؤ کے انحطاط اور اپنی ہذیانی کیفیات کو گردوپیش کی دنیا میں مجسم ہوتے دیکھ کر

شاعر یقین کر لیتا ہے کہ اس کائنات میں آدمی آدمی کے خوف میں مبتلا ہے۔

تماشا شب و روز کا دیکھتا ہوں

کہ ہر بات زیر و زبر ہو چکی ہے

اگر اس پہ میں، "پنیش" ڈالو

تو جھگڑے کا آغاز ہو گا" (ایک ان سینس، ص409)

اس کتاب میں بورخیس کی ایک نظم سے ماخوذ نظم بھی شامل ہے۔

"رات کو اس نے

یوں گھر کا دروازہ کھولا

جیسے کوئی نئی کتاب

دھیرے سے کھولتا ہو" (کتاب اور دروازہ، ص417)

بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ اس مجموعے میں یکے بعد دیگرے شاعر کی کئی مختصر نظمیں بھی شامل کی گئی

ہیں۔ "ڈیٹنگ، گریز، جائیں کدھر، بدقسمتی" ایسی ہی نظمیں ہیں۔

مطالعے کے انہماک کے بعد اب شاعر مطالعاتی انحراف کے درجے پہ ہے۔

"بے روزگاروں میں سے ہوں

ناصحوں سے تنگ ہوں

جو صبر کی تلقین کرتے ہیں

اگر اب صبر کی تلقین کرنے جو بھی آیا

سر اسی کا مونڈھ کر روپوش میں ہو جاؤں گا۔" (ص425)

انیس ناگی زمانہ طالب علمی اور اس کے بعد جس نظریاتی وابستگی کے ہمراہ رہے وہی ان کے لئے باعث شرمندگی بتائی گئی، شاعری کے میدان میں معاشرتی اکائی کی آغاز بچھاڑ اسی ہراسانی سے پیدا ہوئی ہے۔

اہل دنیا ان اشتراکی گروہوں کو غیر معتبر اور آوارہ سمجھتے رہے اور ان کے خیالات کا تعاقب کیا گیا، شاعری کی فضیلت ان کے لئے ہزیمت بن گئی اسی فضا میں نفسیاتی گھٹن کے ساتھ ساتھ شہری کثافتوں کی گھٹن کا اضافہ ہوا۔ پہلے شاعر شہر کے شور اور برق رفتاری سے نالاں تھا اب اس میں فیکٹریوں سے اٹھنے والا دھواں بھی شامل ہے۔

کس لئے کس لئے کس لئے ہم

دھوئیں میں رہیں

ہم سزا یافتہ تو نہیں (ص427)

ایک اور نظم "ہم رذیلوں کے لئے" ملکی سیاسی صورتِ حال کا احاطہ کرتی ہے۔ جس کا ایک سرا ورلڈ آرڈر جاری کرنے والوں کے ہاتھ میں ہے، وقت کے ناگہانی بوجھ تلے دبے ہوئے انسانوں کے ہاتھ سے عقائد کی رسی چھوٹ رہی ہے اور سارے منظر نامے پر وقت کے سمندر کی ایک لہر غالب آگئی ہے۔

صداؤں کا جھاں :

اس مجموعے کا سن تصنیف 1995 ہے اور ایسے بھی جمالیات نے ہی شائع کیا ہے اس میں اکیاون نظمیں شامل کی گئی ہیں، یہاں بے شکل آوازوں کے جنگل میں گم شدہ ساعت بھی ایک الیہ ہے۔ آوازوں کی اس دنیا میں اپنے آپ سے ملاقات کا وقت میسر نہیں۔ اپنی آواز سنائی نہیں دیتی، اپنا چہرہ دکھائی نہیں دیتا۔ اس کتاب میں انیس ناگی نے اپنی مزید بدمزگیوں کا انکشاف اس طرح کیا ہے۔

بھٹکا ہوا ہوں آدمی

میں زندگی کی راہ میں

شک وشبے میں دن کٹے

کب تک رہوں گا اضطراب دائمی کی قید میں؟ (ص496)

یہیں شاعر نے اعتراف کیا ہے کہ وہ ہر طرح کے گریز کے باوجود عورتوں میں ایک کشش محسوس کرتا رہا ہے۔

''پہلے کشش عورت میں تھی

پھر کشش لفظوں میں تھی

اب لفظ عورت بے کشش

اور سب تماشے بے نمک'' (ص497)

الفاظ کی کشش کی عدم موجودگی میں عظیم نظمیں نہیں لکھی جا سکتی ہیں۔ پورا معاشرہ علیل ہے، رزق اور اشتہاد دونوں غائب ہیں، اس شہر علالت میں تشویش کے باعث شہر کا ناظم پریشان ہے اور بلدیہ کے صحن میں خاموش بیٹھا ہے جب کہ سرخ بتی والی جیپ خطرے کے سائرن بجاتی ہوئی اس کے گرد گھوم رہی ہے شاعر ایک بار پھر لفظوں کی رفاقت کی خواہش کرتا ہے لیکن معدومیت کے باعث خاموشی کی زبان جاننے میں مہارت حاصل کرنے لگتا ہے کیونکہ ظلم و بربریت کے عہد میں خاموش سڑکوں پر جوتے پہن کر چل رہی ہے اور الفاظ پر کرفیو لگا ہے اس لئے الفاظ شاعر کو بیجڑے لگتے ہیں۔ 1995 اور اس کے قریب قریب کے زمانوں میں ملک میں مذہبیت کی ایک نئی لہر امڈی اور پھر چھوٹے چھوٹے مذہبی گروہ اپنی دکان چمکانے لگے ہیں انیس ناگی اس مذہب کی اعلانیہ مشق کی جانب اشارہ دیتے ہیں۔

''یہ شہر اذانوں کا ہے

پانچوں وقت خدا کا نام یہاں

بام و در پہ تھراتا پھیلتا جاتا ہے

راہ چلتی اور گھر میں بیٹھی ہر عورت

اپنا پلو سر پہ ڈھلکا لیتی ہے

باہر سڑک پر ٹریفک چلتی رہتی ہے

اور دکانوں پر لوگ سودا سلف خریدتے رہتے ہیں

اور موذن مینار سے نیچے آجاتا ہے۔" (ص506)

انیس ناگی کی جزئیات نگاری اور باریک بینی کی داد دینی پڑے گی کہ وہ مذہب اور معیشت کے درمیانی فاصلے کو صرف جذبات کے خالی پن سے بھرتے ہوئے معاشرے کو کس طرح بیان کرتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں انسانوں کا سب سے بڑا مسئلہ روٹی ہے، اسی کے لئے کاروبارِ زندگی چلایا جاتا ہے، دفتروں میں احمقوں حاکموں کی باتیں سنی جاتی ہیں۔ اس منافق اور متضاد نظریات سے بجی ہوئی زندگی میں لوگ چاہتے ہیں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کسی ایسی بستی میں نکل جائیں جو معمولات سے مختلف ہو کیونکہ یہ دنیا اسی کی ہے جو اسے اٹھا لے۔

زندگی کے معمولات سے اُکتایا ہوا شاعر لوگوں کو دعوت دیتا ہے۔

اگر بدنصیبی کہیں دیکھنی ہے

مرے گھر میں آ تو

یہاں ایک اجڑی ہوئی سلطنت کا سماں ہے (ص516)

اس گھر کے در و بام اجڑے ہوئے ہیں، آئینوں پر نمی جمی ہے۔ گرانی دندناتی پھر رہی ہے۔ تجوری ویران ہے، کتابیں بکھری ہوئی ہیں، شاعر کے بال پریشان ہیں ہر طرف سگریٹوں کا دھواں ہے لگتا ہے سوچنے اور فکر کرنے والا انسان قلعہ بند ہے اور کوئی اس کا مددگار نہیں۔ یہ شاعر وقت سے ڈرا ہوا ہے نہ شاعری کی مشق ہے نہ خوشامدیوں سے رابطہ چنانچہ اس کی زندگی لاحاصلی کا سفر بن گئی ہے۔ کبھی کبھی تو اسے زندہ رہنا بھی حماقت لگتی ہے وہ اپنے آپ کو المیہ قرار دیتا ہے اور صدا لگاتا ہے۔

شعور شودر ہے

اس کی باتوں میں تم نہ آنا

اسی نے مجھ کو تمام دنیا سے دور کر کے

اکیلے پن میں گرا دیا ہے۔ (ص525)

شاعری کے شہر میں گھومتے ہوئے شاعر سوچتا ہے کہ انسان کا انجام کتنا بے مزہ ہے پھر اسے برا کیوں کیا گیا یہی سوچ کر وہ خاموش ہو جاتا ہے۔

میرے پاس خموشی کی لغت ہے

جس سے ساری زبانیں صادر ہو جاتی ہیں۔ (ص533)

خاموشی اور تنہائی کا کھلاڑی سناٹے کا جال بچھاتا ہے اور خود ہی اس میں اسیر ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔

نہ کام کوئی ہے مجھ کو کرنا

ادھر بھی کرسی ادھر بھی کرسی

نرم قالین بچھا ہوا ہے

یہ آبنوسی ہے میز جس پر

نہ کوئی کاغذ قلم سیاہی

جو سوکھ کر رات کے اندھیرے میں کھو گئی ہے (ص548)

معاملاتِ سیاست میں وہ منافقانہ امن کو حالتِ جنگ قرار دیتا ہے اسے احساس ہوتا ہے بطور فرد اس کی عزتِ نفس کا سودا کیا گیا ہے اور وہ خطرے کے سیلاب میں گھر گیا ہے۔

اس کتاب کی مجموعی فضا افسردہ ہے اور ہر شے خالی پن سے بھری ہے

اب طبیعت بھر گئی ہے

ذات، تنہا ذات سے

دوسروں سے کیا ملیں

دوسرے بھی اک خلا ہیں ذات کا (ص556)

درخت میں وجود کا :

یہ کتاب 1997 میں جمالیات نے شائع کی، اس کتاب کے بیک کور پر ستیہ پال آنند کی رائے درج ہے۔

''انیس ناگی نئی اردو شاعری کی تحریک کا بنیادی نظریہ ساز نقاد اور شاعر ہے۔ اس کی غیر معمولی متخیلہ، اس کی نظموں کی کرافٹ اور جذباتی دردمندی نے نئی اردو شاعری میں ایک نئے افق کو ظاہر کیا ہے۔''

اس کتاب کے عنوان کو ذہن میں لایئے تو اندازہ ہوتا ہے شاعر نے اتنی حقیقت ضرور تسلیم کی ہے کہ بیگانگی کے باوجود درخت مٹی اور آب و ہوا سے جڑا رہتا ہے۔ بظاہر اس نے لکھا ہے۔

مرا وجود بے ثمر درخت ہے\
کہ جس کی شاخ پہ نہ یاد کا ہے آشیاں\
نہ آنے والے کل کی آرزو کے برگ و بار\
خواب بھی کوئی نہ محو خواب ہے\
وجود کی جو ٹہنیوں کی آبیاری کر سکے

☆☆☆☆☆

میں خشک و بے نوا درخت\
آب و گل کی قید میں کھڑا ہوا\
لوگ کرسیوں پہ بیٹھ کر\
طرح طرح کی گفتگو میں محو ہیں (درخت میرے وجود کا۔ ص 423-424)

انہدامِ ذات کا خوف بے عمل اور سست روز زندگی کی تصویر پیش کرتا ہے شاعر کے شہر بے رونق نظر آتے ہیں، یہاں صرف شور، دھول اور اشیائے صرف کی یورش ہے۔ ایک صارف معاشرے میں وہ اپنے آپ کو اور زیادہ بے بس پاتا ہے اور اس اساطیری پرندے کے تصور کا مذاق اڑاتا ہے

نے بڑی طاقتوں نے ترقی کی خواہش رکھنے والے ممالک کے لئے تخلیق کیا ہے۔ ہمارے
یاست گر کمپیوٹر کی سرمئی سکرین پر اس پرندے کی شناخت لئے پرندوں کی تصویریں کشید کر رہے
یں جو تصویر بنتے ہی پرواز کر جاتے ہیں نا عاقبت اندیشی کے اس شہر میں لوگ نیلی چھت کے نیچے
نازعات میں مصروف ہیں۔ وقت کا مداری تماشے دکھاتا چلتا جاتا ہے، منتشر ذہن کی سیڑھیوں پر
جھکتی ہوئی سوچ کاہلی اور غفلت کی امین ہے۔

اس کتاب میں شاعر نے ایک نظم "پابلو نرودا" کے لئے لکھی ہے، جس میں وہ اپنے آپ کو اپنے
عہد کے عظیم شاعر کی حیثیت سے دیکھتا ہے جو نئے الفاظ سے نئی شاعری کا جہان تعمیر کرنے جا رہا
ہے، اس نظم میں انیس ناگی نے غزل گوئی سے اختلافی رویہ اختیار کرتے ہوئے لکھا ہے۔

بہت شہر میں ہیں غزل گو

جو عشق بتاں میں گرفتار، ژولیدگی کے پرستار ہیں

اور عروض ان کے پتھر کی مانند مضبوط ہیں (589)

نئی شاعری بھی جسم کی آسودگی اور ذہن کی ابتری میں کمی نہیں لا سکی نہ ہی شاعر کی ازلی اداسی کا
علاج بن سکی ہے۔

"میں چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے

بڑی بڑی نئی دنیا کو

نقطہ نقطہ دیکھوں گا

لفظوں سے لفظ بنیں گے

اور میں لفظ کٹھالی میں ڈھل جاؤں گا

اور فراموشی کی نایاب لغت میں کھو جاؤں گا۔ (لفظ میرے بچے ہیں ص594)

ایک نظم "بھارت" کے نام سے شاعرانہ تکنیک اور کھوج سے بندی ہوئی ہے جس میں خدا کے
نادیدہ تصور اور موجودگی کا بیان ہے۔

''جس کی آواز ہم نے سنی نہیں

جس کے ہاتھ پاؤں ہم نے دیکھے نہیں

کون بتائے کون ہے وہ

جو بھی اس کا نام بتائے

اللہ اس کو حج کرائے'' (ص598)

''درخت میرے وجود کا'' میں کچھ نظمیں شہر لاہور کی صنعتی تبدیلی کے ساتھ ساتھ بہت زیادہ آبادی کے بارے میں احتجاج ہیں۔ شہر کے بدل جانے اور آدمیت کے راستے سے بھٹک جانے کے باعث شاعر ایک طویل تلخی میں مبتلا ہے اور غلاظت اور کثافت سے بھی نجات چاہتا ہے اور منافع خوروں سے بھی۔

یادوں کے خالی کمرے میں گھومتے ہوئے اور عاجزی کی زندگی بسر کرتے ہوئے شاعر تھک چکا ہے اب وہ حصار زندگی کی تیرگی سے بھاگ کر اس مقام تک پہنچنا چاہتا ہے جو صبح کا ستارہ اس کا منتظر ہے، یہیں وہ ایک خیالی سفر میں مبتلا ہے۔

شکر ہے سوچنے کے لئے کچھ نہیں

شکر ہے بولنے کے لئے کچھ نہیں

شکر ہے دیکھنے کے لئے کچھ نہیں

سوچنا، دیکھنا، بولنا سب خرافات ہیں

نام اپنا یہیں چارپائی پہ ہم چھوڑ کر

یاد کے ہر دریچے کو ہم بند کر کے

خالی جیبیں لئے ہم نکل جائیں گے

اس افق کی طرف.................. (ص629)

بیگانگی کی نظمیں:

یہ مجموعہ 2000ء میں شائع ہوا، اسے بھی جمالیات نے شائع کیا۔ بیگانگی کی بنیادی اصطلاح انیس ناگی کی وجودیت پسندی کا اک اور منہ بولتا ثبوت ہے، کتاب کی پہلی نظم تنہائی اور اس کی مسرت اور لذت سے شروع ہوتی ہے۔

"تنہائی بھی کیسی عادت ہے
جب کوئی آجاتا ہے
تو یہ آئینہ چپ چاپ شکستہ ہو جاتا ہے
دوسرا اپنے آپ کو نافذ کر دیتا ہے" (ص647)

اسی تنہائی میں ناسٹلجیا کی کیفیات شامل ہوتی ہیں، شاعر کی کچھ یادیں الجزائر، اس کے ساحلوں اور اس کی عورتوں سے جڑی ہیں جن کا تصور اسے مسرت اور سیرابی عطا کرتا ہے اور پھر اسے یاد آتا ہے۔

"اوہ، وقت بے وفا نکلا اور ہم جنوبی ایشیا کی تنگ نظر دنیا میں لوٹ آئے جہاں تنہائی کی اسیری، لاحاصلی اور بے بیگانگی ہماری منتظر تھی۔"

ماضی کو فراموش کرنے کی خواہش جاگتی ہے اور شاعر شہر کے کہرام کے بارے میں سوچتا ہے جہاں معیشت کی لڑکھڑاہٹ اور سیاست و ریاست کی بالا دستی، حریص اور نامہرباں عورتوں کی موجودگی ہمیشہ اسے ڈراتی رہی۔

معمولات کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو موضوع بناتے ہوئے وہ پھر اپنے اصلی موضوع ویرانی اور تنہائی کی طرف لوٹتا ہے۔

"آنکھیں میری دو گیند ہیں
جو گھومتے ہیں ہر طرف
اور آنکھیں کچھ نہیں ہیں دیکھتیں" (ص659)

ایک بے زار خانگی زندگی اور ایک منحوس دفتری زندگی کے باعث سوچ کا پرندہ زخمی ہے، سب

کچھ گڈمڈ ہوگیا ہے۔شاعر نے اپنے آپ کو اور دنیا کو ایک دوسرے کے مقابل رکھتے ہوئے دو مستقل اکائیوں میں تقسیم کیا ہے جو اپنی اپنی انفرادیت کے مستقل قیام کے لئے ایک دوسرے سے ٹکراتی رہتی ہیں، عمر کی ڈھیلی پڑتی طنابیں طبیعت کی پژمردگی کو مزید بڑھاتی ہیں۔

بیگانگی کے دن کٹے اور رات بھی
بیگانگی اک دائرہ ہے آگ کا
جس کے اندر آگ تھی............

نامہرباں، ناآشنا (ص681)

اس کتاب کی آخری نظم کا عنوان ''الوداع'' رکھا گیا ہے، جس میں شاعر شاعری کو مخاطب کرتے ہوئے اس کی دیوانگی سے علیحدگی اختیار کرتے ہوئے کسی نئے راستے پر چلنے کا متمنی ہے لیکن اس راستے کے انتخاب کا فیصلہ شاعری کے ہاتھ میں ہے۔

جنم ایک آندھی :

یہ کتاب 2007 میں جمالیات نے شائع کی، اس مختصر مجموعے کی نظمیں زیادہ طویل نہیں، ان کی کرافٹ بھی کم و بیش وہی ہے جو انیس ناگی کی پہلی شاعری کی کتابوں میں استعمال کی گئی ہے، ان نظموں کے بارے میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے لکھا ہے۔

''انیس ناگی کی نظمیں ذات کے اندر اور ذات کے باہر کے بحران کا اظہار کرتی ہیں اندر اور باہر کی دنیائیں اس کے لئے نامکمل ہیں اور ان دنیاؤں کے درمیان معلق رات بالآخر بے معنویت کی تاج پوشی سے محظوظ ہو کر ایک مضحک معنویت کا اعلان کرتی ہے۔''

اس کتاب میں خوف کی تین حالتیں موجود ہیں۔شاعر نے تینوں سے بچنے کا راستہ تلاش کرتا ہے۔

''میں یادوں سے ڈرتا ہوں

میں عورت سے ڈرتا ہوں

میں اپنے آپ سے ڈرتا ہوں

میں اپنے آپ میں رہنا چاہتا ہوں"

یہ الفت ذات یا ذاتی حفاظت کا تجربہ انیس ناگی کا پسندیدہ تجربہ ہے۔ عدم اختیار، عدم امید اور سماجی بے زاری نے شاعر کو مستقل خوف میں مبتلا کر رکھا ہے۔

وجود کیسا ملا ہے مجھ کو

جو خوف پیہم میں مبتلا ہے

ہوا کی دستک سے کانپتا ہے

لاحاصلی کا یہ دکھ ہمیشہ سے شاعر کے ساتھ رہا ہے اور اس کتاب میں نئے سرے سے اجاگر ہوا ہے۔

انیس ناگی کے شعری سفر کو "الفت ذات" کا سفر کہا جائے تو مناسب ہوگا، اس سفر میں وہ کئی طرح کے خوف اور اضطراب کا شکار رہے ہیں، ان اندیشوں کا تذکرہ کرتے ہوئے انہوں نے "اعتراف ذات" کے بھی کئی مراحل طے کئے ہیں۔

اپنی تلاش اور پھر کسی دوسری وحدت سے ٹکراؤ کی مسلسل کوشش میں انیس ناگی نے اپنا حریف دنیا کو ٹھہرایا اور پھر اس اضطراب پیہم کو اپنا منشور بنا لیا ہے۔

انیس ناگی کو تجربات کے لئے کئی طرح کے میدان میسر رہے چنانچہ ان کی شاعری بھی مختلف منظر ناموں سے سجی ہوئی ہے ان منظر ناموں میں زرد اور ملگجی تصویروں کی تعداد کچھ زیادہ ہے۔ "پرندہ" انیس ناگی کی شاعری میں حرکت و عمل اور تخلیقیت کی مخصوص علامت ثابت ہوا ہے، یہ پرندہ ان کے خیالات، ان کے الفاظ، ان کے نظریات، ان کے احساسات کی مختلف شبیہوں کو ہمارے سامنے لانے میں بہت مددگار ثابت ہوا ہے۔ اسی طرح ان کی لفظیات میں ایک لفظ "وجود" بھی کثرت سے استعمال ہوا ہے، جو شاعر کی اپنی موجودگی کی نفی بھی کرتا ہے اور اثبات کا مظہر بھی ثابت ہوتا ہے وہ اپنی شاعری میں نئی شاعری کے مروجہ قوانین کے زیر اہتمام لسانی

تجربات سے گذرتے ہوئے آزاد نظم کے مرکب آہنگ کے ساتھ ساتھ نثری نظم کے تجربات سے گذرے ہیں اور کئی نظموں میں دونوں طرح کے تجربات کو یک جا کیا گیا ہے۔ اس شاعری میں اسلوب کے اعتبار سے بڑا تنوع اور نیا پن ہے، نئی شاعری کے رستے پر چلنے والے زیادہ تر شاعر ایک آدھ مجموعے کے بعد یا تو راستہ بدل گئے یا تھک ہار کر بیٹھ گئے، انیس ناگی کا یہ سفر پچاس برسوں سے جاری ہے۔

انیس ناگی نے نئی علامت اور نئی تراکیب سازی کے لئے جس زبان کا انتخاب کیا ہے وہ بہت آساں اور رواں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موضوع کا ابہام جب لفظ کا پیراہن پہنتا ہے تو زیادہ مبہم نہیں رہتا، ان کی نظموں میں استعارہ سلسلہ وار اپنی عمارت تعمیر کرتا ہے اور آخر کار اپنے منطقی انجام کو پہنچتے ہوئے شاعر کے مافی الضمیر کو اجاگر کر دیتا ہے۔

اگرچہ شاعر نے اعتراف کیا ہے کہ وہ سینٹ جان پرس، راں بو اور پابلو نرودا کی شاعری اور کرافٹ سے متاثر رہا ہے لیکن اس کی ذاتی نظموں میں "نوحے" کی نظموں کو چھوڑ کر کسی قسم کی موضوعاتی یا ہیئتی اجنبیت دکھائی نہیں دیتی۔ وہ عروض کے رموز سے واقف ہے لیکن کہیں کہیں نثریت کے فیشن کے زیر اہتمام آزاد نظموں کو بھی نثریت کے پیرائے میں ڈھال دیتا ہے۔

پاکستان کی گذشتہ چھ دہائیوں میں لسانی اعتبار سے جس قدر بھی شاعرانہ تجربے ہوئے ہیں انیس ناگی کا تجربہ زبان آسان فہم اور قابل تقلید ہے۔

انہیں تاریخ، سیاست اور فلسفے سے دلچسپی رہی ہے اور ان معاملات کے لئے انہوں نے جو بھی زبان استعمال کی ہے عام قاری کو بات سمجھانے کے لئے مناسب ہے۔ موضوعاتی اعتبار سے ان نظموں کے کچھ معاملات قابل غور ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ انیس ناگی ان لکھنے والوں میں سے ایک ہیں جنہوں نے اپنی تحریروں کو اپنی ذات کا عکس بنانے کا دعویٰ کیا ہے اور اس بات کی نفی کی ہے کہ تحریر مصنف کی موت ثابت ہوتی ہے۔ مصنف یا شاعر کی موجودگی نے ان کی تحریروں کو ایک ذاتی سوانح عمری میں تبدیل کیا

ہے جس کا ایک فائدہ تو یہ ہوا ہے کہ شخصی اور انفرادی طور پر وہ قاری کی ہمدردیاں وصول کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔

اسی اعتراف شخصیت اور شاعری کا دوسرا سرا عمرانیاتی مطالعے سے جڑا ہوا ہے جہاں ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ سماجی دباؤ یا مختلف اوقات میں متعارف کروائے جانے والے پریشر یا پریشر گروپ کس طرح فرد کی ذاتی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ شاعر کی اپنے شہر سے محبت کا قصہ بھی قابل ذکر ہے۔ لاہور سے انیس ناگی کی محبت شاعری، تنقید، ناول، افسانے میں تو جلوہ گر ہوئی ہے لیکن لاہور کے مخصوص تخلیقی گروہ کو انیس ناگی کی ادبی سربراہی بھی حاصل رہی، اس طرح شہر لاہور ان کی شاعری اور دیگر تصانیف میں ایک داستانوی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ اس موضوعاتی مقامیت کا ایک نقصان ضرور ہوا ہے اور وہ ہے قارئین کی صرف لفظ شہر سے محبت جہاں وہ شہر کے لئے مخصوص نام لکھنا پسند نہیں کرتے اور اس طرح شاعر کے سناریو کو محدود کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

انیس ناگی کے شعری موضوعات میں ایک موضوع عورت بھی ہے جس کے بارے میں ان کے خیالات باقی شعراء سے قدرے مختلف ہیں، کہیں تو وہ لکھتے ہیں کہ ایک عورت کی وجہ سے ان کی زندگی برباد ہوئی اور کہیں وہ اس کی کم شعوری کا تمسخر اڑاتے ہیں۔ یہ مصرع دیکھئے۔

''خوش قسمتی ہے ہر طرح کی عورتوں اور افسروں کا منصف میرے راستے میں منتظر ہے، دان دے کر سب مرادیں جیت لیتا ہوں۔'' (ایک خط، ص486)

''ایک عورت کی محبت میں پریشاں
یہ جنم ضائع کیا ہے'' (ایک عورت کے لئے، ص487)

''ادھر باورچی خانے سے نکلتی عورتوں کا شور
جن کی عقل ساری دیگچی کے گرد ہیم گھومتی ہے'' (ناشتے کی میز پر، ص512)

اس قسم کے خیالات کی موجودگی میں سڈول اور گلابی نظمیں کیسے لکھی جا سکتی ہیں؟

انیس ناگی کی شاعری کا اصل موضوع تنہائی، اداسی، خود رحمی، مایوسی اور عدم توجہ ہے ان موضوعات کو انہوں نے انسانی عدمیت اور آفاقی جبریت سے جوڑا ہے، یہی وجودی رویہ ان کے ناولوں میں اپنی چھب دکھاتا ہے۔

''بیگانگی کی یہ نظمیں'' اردو شاعری میں ایک سنگِ میل ہیں کیونکہ جوذہن بھی رکھتا ہے اور خواب بھی، یہیں ہم اس مجموعے کے آخری صفحے یعنی بیک کور پر شاعری کی تصویر کے ساتھ پابلو نرودا کی ان لائنوں پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

Don't call up my person. I am absent

Live in my absence, as if in a house

Absence is a house so vast

That in side you will pass through its wall

and hang picture on the air

Absence is a house so transparent

That I lifeless, will see you livings

and, if you suffer, my love, I will die again.

انیس ناگی کی ناول نگاری

''وہ سماج جو صرف تحکم اور تعلق کی زبان سمجھتا ہے اسے محبت کی زبان سمجھنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہمارا معاشرتی ڈھانچا افادیت کے سطحی تصور پر استوار ہے، ہم اس کی تکریم کرتے ہیں جو ہمیں منافع یا نقصان پہنچا سکتا ہے ہم ان سے پامال کرنے کے لئے آمادہ ہوتے ہیں جو ہمارے کسی کام کا نہیں ہوتا، ایسے معاشرے میں جہاں علم و ہنر کی تحسین کا ذائقہ نہ ہو، جہاں تعلیمی نصابوں کا معاصر زندگی کی رفتار سے کوئی علاقہ نہ ہو جہاں پسینہ بہا کر بھی ہر ایک کے لئے معیشت کمانے کے مساوی امکان نہ ہوں وہاں ادیب کا پُرسانِ حال کون ہے؟ وہاں ادیب کی بات کون سنے گا ؟ چنانچہ ایسی صورتِ حال میں ادیب کیا سماجی منصب ادا کرے گا؟ ادیب کی آواز کس طرح معاشرے کے گلی کوچوں میں گونجے گی جبکہ نشر و اشاعت کے ادارے ایسے تاجروں کے ہاتھ میں ہیں جو صرف وہی کتابیں شائع کرتے ہیں جو ان کی تجارت کو فروغ دیتی ہیں۔ یہ صورتِ حال بظاہر حوصلہ شکن ہے اور اس میں ادیب بننے کا فیصلہ کرنا اپنے آپ کو کانٹوں پر گھسیٹنے کے مترادف ہے اس پُر صعب راستے پر اب بھی کچھ لوگ چلنے کا فیصلہ کرتے ہیں تو کیوں؟''

(ادیب کی سماجی ذمہ داری، تشکیلات، ص59)

انیس ناگی کی ناول نگاری میں ہم اسی کیوں کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔

انیس ناگی کی تنقیدی فہرست میں جن ناولوں یا ناول نگاروں نے جگہ پائی ہے ان میں سب سے پہلا نام توبۃ النصوح اور ابن الوقت کے خالق مولوی نذیر احمد کا ہے، دوسرا نام مرزا ہادی رسوا

کا ہے جنہوں نے متعدد ناول لکھے لیکن شہرت امراؤ جان ادا کے حصے میں آئی، اس ناول کے بارے میں انیس ناگی کی رائے ہے۔

''اگرچہ اردو میں معیاری ناولوں کا فقدان ہے اور دن بدن ان کی تخلیق بھی کم ہوتی جارہی ہے کیونکہ ناول لکھنا کلرکی کرنے کے مترادف ہے، بے شمار صفحات کی تحریر، کرداروں کا دھیان رکھنا، پلاٹ کی چولیں کسنا وغیرہ مشکل کام ہے، تاہم اردو میں خال خال ایسے ناول مل جاتے ہیں جو اردو میں ناول کی پختگی اور اس کے بہتر امکان کی نشاندہی کرتے ہیں۔'' (تشکیلات، ص 119)

قراۃ العین اور ان کے ناولوں پر بھی مصنف نے اظہار خیال کیا ہے اور لکھا ہے۔

''آگ کا دریا'' کی اشاعت کے بعد قراۃ العین کا ادبی امیج اور اس کے ساتھ ہی اس کے بارے میں ادبی آراء میں تغیر آنے لگا کہ وہ طبقاتی ناسٹالجیا کے چوکھٹے سے باہر نکل کر بڑے موضوعات پر ناول لکھنے کی ہمت رکھتی ہے۔ آگ کا دریا اردو کا پہلا ضخیم ناول تھا جس میں ڈھیلی ڈھالی نثر کے باوجود قراۃ العین نے اردو میں ناول کے سکوپ کی موضوعاتی توسیع کی تھی۔''

انیس ناگی کی یہ رائے ''گردشِ رنگِ چمن'' تک آتے آتے اس طرح تبدیل ہوئی ہے۔

''گردشِ رنگِ چمن ایک اکتا دینے والا ناول ہے اس میں معاشرتی زندگی کی جو تفاصیل پیش کی گئی ہیں ان سے صرف اہلِ لکھنوہی لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔''

دیگر عصری ناول نگاروں میں انیس ناگی نے انور سجاد، انتظار حسین، عبداللہ حسین، مستنصر حسین تارڑ اور ممتاز مفتی کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ ان سب ناول نگاروں کے بارے میں انیس ناگی کی آراء عام قارئین سے قدرے مختلف ہیں، مثلاً وہ انتظار حسین کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''انتظار حسین ناول کے میدان کے ادیب نہیں وہ چھوٹے کینوس پر اچھی کہانی بنا لیتے ہیں۔'' (معاصر ادب، ص 10)

اس طرح عبداللہ حسین کے ''نادار لوگ'' کے بارے میں ان کا خیال ہے۔

"یہ ناول کسی سکیم کے بغیر لکھا گیا ہے اس لئے تاریخ ناول سے باہر رہتی ہے۔۔۔
900 صفحات میں عبداللہ حسین کچھ Build نہیں کر سکے، ان کا اپنا زندگی کا
پرسپشن عامیانہ ہے اس لئے ناول میں قصباتی زندگی کا بیان کسی جیرت اور دلچسپی
سے خالی ہے۔" (سامراد ب، ص14)

ان بیانات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انیس ناگی کلاسیکی ناول نگاری کے علاوہ عصری ناول نگاری کے بھی باقاعدہ قاری ہیں اور ناول کی ساخت کے بارے میں اپنے مخصوص نظریات رکھنے کا حق بھی محفوظ رکھتے ہیں، چنانچہ ان کے ناولوں کے بارے میں ان کا ایک تنقید نگار کہتا ہے۔

"اردو ناول کی تاریخ انیس ناگی کے بغیر ادھوری رہے گی انہوں نے جو ناول تحریر
کئے اس میں سے ہر ناول ایک نیا موضوع ہے، یہ ناول اپنے کرداروں اور
موضوعات کے اعتبار سے وجودی فلسفہ کو پاکستانی صورت حال کے حوالے سے
ایک نئی فکری جہت دیتے ہیں، ان کے ناول اردو ناول کی روایت سے ایک انحراف
ہیں کہ ان کے موضوعات عشق ومحبت سے جنم لیتے ہیں اور نہ ہی امیروں، رئیسوں کی
زندگیوں کے ترجمان ہیں، ان کا موضوع آج کے دور کی انسانی حقیقت ہے وہ عام
آدمی کے لئے احترام کا تقاضا کرتے ہیں" (ایک وجودی ناول از زاہد مسعود)

انیس ناگی کے ناولوں کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ انہوں نے دوستوئیفسکی، کافکا، کامیو، آندرے ژید جیسے ناول نگاروں کو پاکستان کی ادبی روایت کا حصہ بنایا اور انسان کے وجودی کرب کو ایک تخلیقی بیان عطا کرتے ہوئے ناول نگاری کے فلسفہ کو نئے امکانات سے روشناس کیا۔ یہیں ہم فرداً فرداً ان کے سب ناولوں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے ہیں اور اپنے عہد میں ادیب کا بطور فرد درجہ متعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

دیوار کے پیچھے :

یہ ناول 1970 میں لکھا گیا لیکن اس کا سن اشاعت 1980 ہے، اسے پہلی بار فیروز سنز

لاہور نے شائع کیا، اس کی دوسری اشاعت 1988 میں ہوئی۔

ناول میں ایک پروفیسر کی کہانی بیان کی گئی ہے جو لاپتہ ہو گیا ہے، کتاب کے پہلے باب میں احمد جو پروفیسر کا دوست ہے بیان دیتا ہے کہ پروفیسر نے خودکشی کی کوشش کی تھی لیکن موت نے اسے قبول نہ کیا، بقول احمد جب وہ پروفیسر کے گھر پہنچا تو وہ لاپتہ ہو گیا لیکن گمشدگی سے پہلے اس کے لئے ایک سربمہر بنڈل چھوڑ گیا تھا، یہ بنڈل دراصل ''دیوار کے پیچھے'' کا مسودہ ہے، پروفیسر نے دوست کے نام ایک خط میں لکھا ہے۔

''احمد! میں بہت منتشر ہوں، تھکا ہوا بے مراد منکر ہوں، میرے اندر خلا ہی خلا ہے، میں حقیقت بننا چاہتا تھا لیکن مجھے روک دیا گیا ہے، نہ جانے کیوں ابھی تک خلیوں میں زندگی کی رطوبت باقی ہے میں نے اپنا حساب چکا دیا ہے، میرا کوئی مطالبہ نہیں ہے۔ میں زندہ نہیں رہنا چاہتا تھا اس کے باوجود زندگی نے کہا اسے میری ضرورت ہے کیسا اتفاق ہے کہ مجھے اپنی ضرورت نہیں ہے پھر میری موجودگی پر کیوں اصرار کیا جارہا ہے؟ ۔۔۔۔الوداع۔۔۔۔میں مستقبل کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تاہم تمہارے اور اپنے درمیان رشتے کا یہ باب ختم کرتا ہوں۔''

احمد دوست ہونے کی حیثیت سے پروفیسر کی تحلیل نفسی کو اس کے بچپن اور سکول کے زمانے سے جوڑ دیتا ہے اس کے نزدیک بچپن سے حساس اور زود رنج ہونا ہی اس کی ناکامی کی دلیل ہے۔ دراصل ''دیوار کے پیچھے'' اس مردود شہر میں فرد کی سرگذشت جسے مصنف اپنے خوابوں کا شہر قرار دیتا ہے لیکن اس شہر میں عظمت اور امان نہیں محض سفلہ پن اور رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ ہے، یہاں فرد اپنے تئیں عضویاتی کل نہیں بن پاتا، عدمیت کے اس فضا میں کرب اور بے معنویت کا تجربہ دوستوئیفسکی کے ایڈیٹ کے فلسفے کے بہت قریب ہے، انیس ناگی کا پروفیسر لایعنی کائنات میں بلا جواز پھینکا گیا اینٹی ہیرو ہے۔ برگشتگی کی تجسیم نامکمل، وہ اپنی موجودگی کے امکانات تلاش کرتا پھرتا ہے، مایوسی اور مجہولیت میں وہ اپنے آپ سے سوال کرتا ہے کہ وہ کس کے سامنے جواب دہ ہے؟

کتاب میں تذکرہ کیا گیا ہے کہ پروفیسر کا جرم آزاد خیالی ہے اس الزام کا جواز اس کے لباس

بے ترتیبی، بالوں کی طوالت، معاملات کی بے ترتیبی اور پائپ پینے کی عادت میں تلاش کیا گیا
ا کی بنا پر لوگ اسے ''سرخا'' کہتے ہیں۔ پروفیسر کے جرائم کی تفصیل بھی عقلی کرب پر رکھی گئی
۔ اس معاشرے میں اس کی موجودگی اس کا سب سے توانا جرم ہے، سوسائٹی اسے رد کر چکی
۔ سیاسی اور غیر سیاسی کارندے اس کے تعاقب میں ہیں۔ سرکار اسے مشکوک قرار دے چکی ہے
بلکہ اس نے اپنی تنہائی کو ممنوعہ موضوعات پر غور و فکر کے لئے مختص کر رکھا ہے وہ فکری اور عقلی
ادی کا طلب گار ہے۔ وہ ہر بات کی وضاحت چاہتا ہے اسے مقاصد اور معنویت تک رسائی
ار ہے وہ اپنی رنجیدگی کا جواز چاہتا ہے، اشیا کے باہمی ربط کی منطق اور وضاحت کی خواہش
ے امکان سے منکر ہونا چاہتا ہے، اسے احساس ہوتا ہے وہ اپنے سائے کی دیوار کے پیچھے سکڑ گیا
ہے اب وہ اسی دیوار سے رہائی چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

''اوہ، میرے اندر زراج ہے مجھے روحانیت کی طرف رجوع کرنا چاہیے کہتے ہیں کہ
شکتی انسان کے اندر ہوتی ہے، اس سوچ میں ایک دفعہ میں نے اپنا ایکسرے کرایا تو
میں اس کا نیگٹو دیکھ کر کھلکھلا کر ہنسنے لگا کہ میرے اندر رگوں اور فضلے کی بڑی آنت
کے سوا کچھ نہیں تھا، میں نے خوف زدہ ہو کر روحانیت اور شکتی سے منہ موڑ لیا۔''

جسمانی نظام کی پیچیدگی اور عائد کردہ روحانیت کا چھل بل پروفیسر کی کیمیاوی ساخت کو یک جا
ہیں ہونے دیتا، خدا معلوم وہ کائنات کے مرکزے سے کس لمحے جدا ہوا تھا کہ پھر زمین کی کشش
س کے پاؤں نہیں پکڑ سکی، استحصالی معاشرے سے بچاؤ کی خواہش میں وہ خود بھی اپنے استحصال
پر مامور ہوا ہے، مصالحت کا جبر اور انتخاب کا جبر پروفیسر دونوں پاٹوں کے درمیان کہیں پس کر رہ
گیا ہے، اس ہونے اور نہ ہونے کے چکر میں اس کا وجود اس طرح پارہ پارہ ہوا ہے کہ موت یا خودکشی
کی موجودگی بھی بے جواز ہو گئی ہے، گم شدگی کا تصور مصنف کے ذہن میں عیسائیت کے مذہبی
رجحانات کی جانب ہلکا سا اشارہ دیتا ہے، جہاں جرم ثابت ہونے پر عیسیٰؑ کو مصلوب کیا گیا اور وہ
سب اذیتوں سے نجات پا گئے، کیونکہ الہامی کتابیں یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتی رہیں کہ ان کا
مصلوب ہونا دراصل ان کا زندہ اٹھا لیا جانا تھا۔

انیس ناگی کا یہ ناول پاکستان کی جس سیاسی صورت حال میں لکھا گیا ہے وہ روسی نظریات کی ترقی پسندی اور امریکی نظریات کی راست بازی کا زمانہ تھا، اشتراکیت اور اسلامیت کی اس بنیادی چیرہ دستی میں ہر اس شخص کو نقصان پہنچا تو اپنی ہی زمین پر اپنا وقوف چاہتا تھا۔ وقوف کی یہی بے وقوفی ''دیوار کے پیچھے'' کے ہیرو کا المیہ ہے انہی زمانوں میں انیس ناگی نے کامیو نے ناول اجنبی اور پھر سس فس کی کہانی کے اردو تراجم پر توجہ دی جنہوں نے مصنف کی وجودی نظریے کے مزید قریب کر دیا۔

پروفیسر دو بار ارادی موت کے تجربے سے گذرتا ہے پہلی بار خودی کے تصوری رومانیت میں گم ہو کر وہ کہتا ہے۔

''میں اپنی زندگی کا تسلسل برقرار رکھ سکتا ہوں ۔۔ موت سے زیادہ موت کا خوف حواس سلب کر لیتا ہے ۔۔ میں نے زندگی کو تج دیا ہے ۔۔۔ میری آزادی کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ میں نے مرنے کا فیصلہ کس دباؤ کے بغیر کیا ہے۔''

دوسری مرتبہ وہ اپنی نئی گمشدگی کی دلیل دیتا ہے۔

''دریا نے مجھے قبول نہ کیا، مجھے مالِ مسروقہ کی طرح برآمد کیا گیا ہے۔ کیا مجھے تھوکی ہوئی زندگی کو پھر چاٹنا ہے؟ میں نے ۔۔۔ اپنی مکروہ سوانح عمری کو لفظوں میں منتقل کیا ہے، ایک مرتبہ پھر لاپتہ ہونے سے قبل یہ اوراق احمد کے حوالے کر دوں گا، کیونکہ جملہ حقوق محفوظ ہیں۔''

پروفیسر کا اپنے لفظوں میں زندہ رہنے کا عزم سارتر کے ناول ''ناسیا'' کے ہیرو کی ایک اور مثال ہے جو زندگی کی بے معنویت کو ناول نگاری میں ضم کر کے انتقال خواب و خیال کی خواہش کو امکان کی بازیافت قرار دیتا ہے۔

1980 کی دہائی میں انیس ناگی کا یہ ناول بے حد مقبول اور انوکھا ناول قرار دیا گیا، ناول کی تفصیلات کو اگر انیس ناگی کی سرگذشت کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو اس میں ایسی کئی باتیں اور واقعات موجود ہیں جنہیں انیس ناگی نے آپ بیتی کے طور پر بیان کیا ہے، اس طرح مصنف کی

اتی موجودگی اس کی ناول نگاری کو حقیقت پسندی کی خاص خوبی عطا کرتی ہے جس سے تحلیل نفسی کا عمل مزید دلچسپ ہو جاتا ہے۔

ناول کی زبان آسان تاہم بیان مبہم ہے بعض معاملات کی تکرار، مصنف کی ذہنی صورت حال کی خاص جہت کی جانب اشارہ دیتی ہے۔

میں اور وہ :

دیوار کے پیچھے کا استقبال اور تنازعہ دونوں ایک ساتھ مصنف کا پیچھا کرتے رہے اسی رائے زنی کی فضا میں 1983ء میں "میں اور وہ" شائع ہوا، اسے بھی فیروز سنز نے شائع کیا۔

انیس ناگی کے یکے بعد دیگرے دو ناول مصنف کے وجودی نظریات کی ارتقائی صورت بنے، اسی اثنا میں انتظار حسین کا بستی، عبداللہ حسین کا باگھ، فہیم اعظمی کا جنم کنڈلی اور بانو قدسیہ کا ناول راجہ گدھ بھی شائع ہوئے، عمومی رائے میں "راجہ گدھ" باقی ناولوں پر مقبولیت اور کرافٹ کے اعتبار سے بھاری رہا، تاہم انیس ناگی کا دوسرا ناول پہلے جیسے ناول کی شہرت حاصل نہ کر سکا اسے چھوٹے کینوس کے ناول کا درجہ ملا، اس کا ہیرو کم و بیش اسی نفسیاتی عارضے میں مبتلا تھا جس سے دیوار کے پیچھے کا پروفیسر دو چار رہا۔

"میرا وجود میرا شعور ہے اور میرا شعور میری سزا ہے" اگر انیس ناگی نے "میں اور وہ" کے ہیرو کو بین الاقوامی تناظر میں رکھنے کی کوشش کی، ہیرو پاکستان سے باہر ایک معروف انقلابی ملک میں رہا جہاں اسے یہی احساس ہوتا رہا کہ اس کا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ الجزائر میں جہاں ناول کا ہیرو یا مصنف موجود ہے عربی ممالک سے آئے ہوئے کرداروں کا اجتماع ہے، عیش کوشی ہے، آزادانہ جسمانی زندگی بسر کرنے والی عورتیں ہیں، لیکن اسی آزادی کی فضا میں غلام میڈیا صرف شخصیت پرستی کی ثنا خوانی پر مامور ہے، نام نہاد انقلاب پسندی جمہوریت کی بنیادی روح کے منافی ہے چنانچہ اس فضا میں ناول کے ہیرو کی شخصیت میں مزید توڑ پھوڑ پیدا ہوتی ہے اور وہ خود کلامی کے مرض میں مبتلا ہوتا ہے۔

مصنف ہمیں بتانا چاہتا ہے کہ دنیا کے کسی خطے میں بھی چلے جائیں انقلاب صرف ایک نعرہ ہے

، ورنہ ہر جگہ گھٹن ، استبداد اور جبر کی حکمرانی ہے، ناول تیسری دنیا کے ان ممالک کی تصویر کشی کرتا ہے جہاں انسان ریاکاری کے فن میں طاق ہیں۔

جہاں تک ہیرو کے پس منظر کا تعلق ہے اسے فسادات کے دوران حنیف نامی ایک شخص اٹھا کر لے آتا ہے جس کوٹھی میں وہ رہ رہے ہیں وہ اس کے مرحوم باپ کی ملکیت تھی لیکن حنیف کے مرنے کے بعد اس کی بیوی اسے ہتھیانے کے چکر میں ہے۔ اس لئے مقدمہ بازی کا آغاز ہوتا ہے اور ہیرو اس کمرے میں محصور ہو کر رہ جاتا ہے، اسے دفتر میں اپنے افسر کے جبر کا بھی سامنا ہے ، اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کی خفیہ سالانہ کارکردگی رپورٹ خراب کرنے کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں، انہی مسائل سے گھبرا کر وہ عرب ممالک میں پناہ لینے کا خواہش مند ہے لیکن وہاں بھی صورتحال مختلف نہیں، وہ اپنے آپ کو ایک گم نام پرندہ محسوس کرتا ہے۔

''زمین کا گنبد تقسیم ہو چکا ہے طول بلد اور عرض بلد کی لکیریں اس تقسیم کی دلیل ہیں''

زمانہ ہیرو سے مفاہمت اور سمجھوتے کا طلبگار ہے، ہیرو کی زود حسی اور خود رحمی ان لاکھوں لوگوں کی عکاسی کرتی ہے جنہیں مفاہمت پسند احمق اور جنونی قرار دیتے ہیں۔

اس ناول میں بقول ڈاکٹر وحید قریشی بیانیہ کو فلیش بیک سے منسلک کر کے کہانی کو آگے پیچھے جوڑنے کا عمل انیس ناگی کی تکنیکی کارکردگی کا مظہر ہے، ناول کے بعض حصے حسن کاری اور اظہار و بیان کی بے پناہ صلاحیتوں کا نمونہ ہیں، کہیں کہیں اردو نثر کے بعض پرکشش پیراگراف ملتے ہیں۔

مجموعی اعتبار سے اس ناول کو مصنف کی خود کلامی کا ایک نمونہ سمجھنا چاہئے۔ یہ ہیرو جذبات و احساسات کی کشمکش کے ساتھ ساتھ اقتصادی اور سیاسی جبر کا بھی شکار ہے۔ ماحول سے عدم مطابقت غصے اور بے سکونی کو دعوت دیتی ہے اور یہ تشدد پسندی جارحیت کی سطح سے نکل کر لاتعلقی کے دائرے میں داخل ہوتی دکھائی دیتی ہے۔

''میری نسل بیمار نسل ہے اس کے پاس سوچنے کیلئے کچھ نہیں، یہ عہد زوال ہے''

''دیوار کے پیچھے'' سے ''میں اور وہ'' تک مصنف کے وجودی رویے میں کوئی تبدیلی دکھائی نہیں دیتی۔

زوال :

''زوال'' پہلی مرتبہ فیروز سنز لاہور نے 1989 میں شائع کیا انیس ناگی نے ''میں اور وہ'' میں ایک جگہ لکھا تھا۔

''...... میں کسی لغو سوچ میں کھو گیا ہوں، ماضی؟ یہ مجھے کیا دے سکتا ہے؟ اس طرح تو مستقبل بھی لغو ہے کہیں بھی روشنی کی کرن نہیں ایک مایوسی ہے، اعتماد کی کمی ہے ہر ایک سے خوف آتا ہے۔ حال نے کونسی مشکل آسان کر دی ہے کہ میں زمانوں کا گلہ کروں، ہر زمانہ مجھے وقت کے درمیان چھوڑ کر نکل جاتا ہے اور میں وقت کے لمحات گنتا گنتا زندگی میں کچھ کئے بغیر، عمر کی اس دہلیز پر محو سوچ ہوں جس کے آگے زوال، بیماری اور خوف ہے''

اسی خوف، ناامیدی اور جذباتی بے معنویت کو ''زوال'' میں اجاگر کیا گیا ہے۔ یہ کہانی ایک بیوروکریٹ ''احسن'' کے گرد گھومتی ہے جو مسلسل بے زاری اور عدم اطمینان کا شکار ہے، وہ اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ ملکی نظام کو بگاڑنے میں بیوروکریسی کا بڑا ہاتھ ہے، ایک بار ایک ورکشاپ کے دوران اسے اس نظام کی تہہ دار عیاری کا شدت سے اندازہ ہوتا ہے اور وہ سوچتا ہے یہ سارا نظام شک اور عدم اعتماد پر چلتا ہے تبھی تو پندرہ برس گزرنے کے باوجود اس کی ترقی کا معاملہ جوں کا توں ہے۔ اس نے ایک دن دانت پیس کر اپنے افسر کے سامنے احتجاج کیا تو اسے جواب ملا۔

''میاں تمہارے پیچھے کوئی نہیں''

تب اس نے سوچا تھا ''میرے پیچھے میرا سایہ ہے'' (ص 8) اب وہ اس کا سایہ ایک دوسرے کے تعاقب اور رفاقت میں اپنا اپنا سفر کاٹ رہے ہیں، احسن کا ذہن الجھاووں کا شکار ہے، وہ طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہے اور اس کی بیوی رشیدہ اپنے بیمار خاوند، اپنی ملازمت میں بٹی ہوئی ہے، احسن کو وراثت میں سوائے اضطراب اور موروثی گھر میں ایک حصے کے علاوہ کچھ نہیں ملا

تھا، اس قسم کی دوسری محرومیاں ہر لمحہ احسن کو گھیرے رکھتی ہیں، ورکشاپ کے دوران وہ اپنے بیوی بچوں کو یاد کرتا ہے اچانک ایک دن اس کا دایاں کان جھنجھنانے لگتا ہے اس کا معالج کہتا ہے کہ وہ کارڈیک نیوروس کا مرض ہے اسی لئے اسے بدن کے ہر حصے میں دل کی دھڑکن محسوس ہوتی ہے ۔واپسی پر اس کا دوست حمید جس سے وہ پہلے ہی حسد میں مبتلا ہے اسے گاڑی میں ڈال کر اسلام آباد سے لاہور روانہ ہوتا ہے۔

''احسن کی شادی کو اٹھارہ برس ہو چکے ہیں وہ ابھی تک اپنی بیوی رشیدہ کو نہیں سمجھ سکا جو کم بولتی زیادہ سوچتی اور کم سے کم ردعمل کا اظہار کرتی ہے، احسن سوچتا ہے کہ وہ بیمار نسل سے ہے جسکی میراث نزاع کے علاوہ کچھ نہیں اس لئے اس کے سارے ارادے ژولیدہ ہو چکے ہیں، احسن ایک مکان بنانے کا پلان بناتا ہے ایک درمیانے درجے کا افسر ہونے کی حیثیت سے وہ اپنے آپ کو ماتحتی اور افسری کے درمیان پاتا ہے، اس وقت وہ جس عمارت میں کام کر رہا ہے وہ کرائے کی سہ منزلہ عمارت ہے جو کہانی کے ولن کالے شاہ کے کسی عزیز کی ملکیت ہے، ادھر رشیدہ کو اس کی ایک دوست راشدہ طرح طرح سے ورغلاتی رہتی ہے اور رشیدہ کے لئے احسن کا روز بروز بڑھتا ہوا چڑچڑا پن نا قابل برداشت ہوتا جاتا ہے بچے اور میاں بیوی سب جھگڑے بازی میں مصروف ہیں، احسن کی بیماری بڑھتی جاتی ہے اور آنکھ بھینگے پن کا شکار ہو جاتی ہے، ڈاکٹر اسے ایک تعارفی خط دے کر دوسرے ڈاکٹر کی طرف بھیج دیتا ہے تب احسن سوچتا ہے'' سارا شہر صحت مند ہے، لیکن ایک گمنام شخص کی تشخیص کیلئے تمام علوم ناکارہ ہو چکے ہیں...... مجھے کسی سنیاسی یا ماہر روحانیات کے پاس جانا چاہئے'' (ص66)

ڈاکٹر ماجد احسن کا فیملی ڈاکٹر ہے، احسن معائنے کے دوران اپنی بیماری کی وجہ دریافت کرتا ہے اور ڈاکٹر سوچتا ہے'' ایمرجنسی کا کیس ہے'' وہ اسے گاڑی میں ڈالتا ہے اور ڈاکٹر جمیل کے کلینک لے چلتا ہے، ڈاکٹروں کی مصروفیت کے بارے میں ماجد کہتا ہے۔

''احسن یہ بھی بیوروکریسی ہے، شہر کے ہر فیشن ایبل علاقے میں ان کی برانچیں قائم ہیں، ان کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ یہ ہر ایک کی نبض پر ہاتھ رکھ دیتے ہیں، یہ سرمائے کی نئی مملکت بنا رہے ہیں۔'' (ص72)

کلینک میں بیٹھے بیٹھے احسن کی حالت متغیر ہونے لگتی ہے۔ پسینہ آنے لگتا ہے کان سرخ ہو جاتے ہیں، چہرہ زرد اور ہونٹ کانپنے لگتے ہیں۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ بینائی سے محروم ہو رہا ہے، یہ احساس دماغ پر دباؤ کے باعث ہے، احسن پھر اپنی اور اپنے والد کی ملازمت کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔

''میرا والد ایک اوسط درجے کا افسر تھا، وہ میرے ذریعے اپنی تمام عمر کی ہتک کا بدلہ لینا چاہتا تھا لیکن وقت نے اسے مہلت نہیں دی۔ اب کوئی چارہ نہیں میں ان لوگوں میں سے ہوں جن سے معاشرہ تغافل برت رہا ہے'' (ص82)

اس بیماری کی حالت میں وہ ماضی کے ایوانوں میں بھٹکتا رہتا ہے اور اپنے سیاہ چشمے کے پیچھے دوسری آنکھ کی بینائی کی دعا کرتا رہتا ہے، آخر کار انہی بیماریوں کے دوران ریڈیئیشن کی ضرورت پڑتی ہے اور اسی عمل میں احسن مزید مسائل سے گذرتا ہے۔ ناول کے آخری صفحے پر ایک دن احسن ایک کار ایکسیڈنٹ میں مر جاتا ہے کہانی کے دو دوسرے کردار ساجد اور شرجیل بھی موت سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ انیس ناگی کے ایک ناقد محمد سلیم الرحمٰن نے اس ناول کے ہیرو کو فرانز کافکا کی طویل کہانی ''کایا کلپ'' کے ہیرو ''ساسا'' سے مماثل قرار دیا ہے۔ جب کہ 'زوال' اشتباہات کے حوالے سے اسی نوع احساس کا شکار ہے جو ہمیں مصنف کی آپ بیتی میں دکھائی دیتے ہیں، ہسٹریائی نظام میں ذہن کے ساتھ ساتھ جسم کی شمولیت اور پھر موت کی موجودگی کی مسرت اور خوف سب معاملے اس ناول میں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

مصنف بیوروکریٹ ہونے کی حیثیت سے اس بات کا بھی اعتراف کرتا ہے کہ طاقت اور اختیار کی جگہ پر بیٹھ کر جب حکمران اختیار سے کام نہیں لے سکتے تو بھی نئی قسم کے الجھاوے پیدا ہوتے ہیں اور بے انصاف آنکھیں آخر آخر دوہرے جبر کا شکار ہو کر دیکھنے ہی سے منکر ہو جاتی ہیں

تعلیم بالغاں کی انٹرنیشنل ورکشاپ، مندوبین کا شور، تیسری دنیا کی بحالی کے نام پر سیر سپاٹوں اور اچھے اچھے کھانوں کا اہتمام ہیرو کی آنکھیں اس منافقت سے ہمکنار پیدا نہیں کر سکیں اور آخرکار سماجی و سیاسی منظر ناموں کو رد کرتے ہوئے بے نور ہونا پسند کرتی ہیں۔ کہیں یہ تشنگی میں ماجد اور رشیدہ کی محبت میں احسن کی موت کا ایک سبب ہے۔ مصنف نے بہت سے تضادات کو بڑی مہارت سے کہانی سمو رہا ہے۔ اور کئی ناقدین اسے انیس ناگی کا بہترین ناول سمجھتے ہیں۔

ایک گرم موسم کی کہانی :

اس ناول کو روہتاس بکس نے 1990 میں لاہور سے شائع کیا۔ زوال میں مصنف نے ایک ایسی عمارت کی طرف اشارہ دیا تھا جو دارالخلافہ کے وسط میں ہے سہ منزلہ ہے اور ایک شاہ صاحب کے رشتہ دار اس کے مالکان ہیں۔ اسی طرح کی ایک اور عمارت سے ایک راستہ سفر کرتا ہوا 1857 کی جنگ آزادی کے ان دریچوں پر کھلتا ہے جو لاہور اور پنجاب کے تاریخی منظر نامے کا حصہ ہیں۔ یہاں مصنف دستاویزی فکشن کے تجربے میں پوری طرح کامیاب ہے اور ان بین الاقوامی رجحانات کا غماز ہے جہاں ادب اور تاریخ دونوں کو یکجا کر کے عروج و زوال کے واقعات کی توجیہات تلاش کی جاتی ہیں، بقول محمد علی صدیقی۔

> "انیس ناگی کا یہ تاریخی ناول 1857 کی جنگ کے بارے میں ایک نقطہ نظر پیش کرتا ہے وہ یہ کہتا ہے کہ اگر ایک معاشرہ سیاسی طور پر مغلوب ہو جائے تو اس مردنی کے باوجود اس میں باحوصلہ افراد بھی موجود ہوتے ہیں جو اجتماعی وجود کی بقا کے لئے انفرادی قربانی دیتے ہیں، انیس ناگی نے اس ناول میں گذشتہ صدی کے لاہور کی زندگی کو بڑے موثر طریقے سے پیش کیا ہے۔" (ایک وجودی ناول نگار، ص 0...)

اس ناول میں تین کہانیاں ساتھ ساتھ چلتی ہیں اور پھر ایک کہانی میں مدغم ہو جاتی ہیں کہانی کا مرکزی ہیرو جاوید حکومت پنجاب کے ریکارڈ کا انچارج ہے اور اتفاقیہ طور پر باضمیر، ایماندار اور حساس آدمی ہے، اس نے دو نائبین ریسرچ آفیسرز کو شک پڑ جاتا ہے کہ جاوید تاریخ کا ریکارڈ

درست کرنا چاہتا ہے چنانچہ ذہنی تصادم شروع ہو جاتا ہے اور جاوید تاریخ کی سچائی کی تلاش میں 1857 کے زمانے تک جا پہنچتا ہے، ناول کے اندر جو ہلچل ہے وہ انگریز افسران اور پادری کی تشویش کے گرد گھومتی ہے، ناول میں ہندو، مسلمان اور سکھ کردار موجود ہیں، ناول میں جاوید کے ایک بوڑھے اہل کار کو سارا ریکارڈ ازبر ہے کیونکہ وہ جنگ آزادی کا آخری مجاہد ہے، ایک دن یہ ریکارڈ موسم کی گرمی کی وجہ سے جل جاتا ہے اس دوران جاوید اپنی ریسرچ کی تفصیلات نعم البدل کے طور پر گمشدہ ریکارڈ کی جگہ رکھ دیتا ہے۔

یہیں ہماری ملاقات انیس ناگی کے ناولوں کے بنیادی ہیرو کے مستقل رویوں سے ہوتی ہے، جاوید بھی پروفیسر اور احسن کی طرح ایک دوسرے درجے کا افسر ہے جو ملازمت میں افسروں کو بعض باتوں پر ٹوکتا ہے، جاوید کو انہی عادت کی وجہ سے او۔ایس۔ڈی لگایا گیا ہے، وہ ایک اکھڑا ہوا آدمی ہے جس کی بیوی شیزوفرینیا کی مریض ہے، دفتر میں کام کرتے ہوئے اسے ہمیشہ اندیشہ رہتا ہے کہ اس کی بیوی کوٹھے سے کود کر خودکشی نہ کر لے، اس کے اندیشے کے مطابق کتاب کے بیسویں باب میں اس کی بیوی آخرکار خودکشی کر لیتی ہے۔اس طرح اس ناول میں بھی مصنف موت، خوف اور اندیشے کے موضوعات کو آگے بڑھانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

انیس ناگی کا کہنا ہے کہ یہ ناول ان دنوں کی تصنیف ہے جب وہ پنجاب آرکائیوز کے ڈائریکٹر تھے، 1857 کے تناظر میں اس سے پہلے اس قسم کے تاریخی شواہد سے مزین ناول نہیں لکھا گیا۔

ایک لمحہ سوچ کا :

یہ ناول جمالیات نے 1991 میں شائع کیا، یہ مختصر ناول بھی ایک گرم موسم کی کہانی کے سلسلے سے منسلک ہے، اس کا پلاٹ سقوط دہلی، بہادر شاہ ظفر کی معزولی، حراست اور جلاوطنی کی جانب اشارے دیتا ہے اس ناول کے سرورق پر میجر ہڈسن بادشاہ کو حراست میں لئے ہوئے ہے یہ تصویر کسی انگریز مصور کی بنائی ہوئی ہے جس میں بادشاہ اور نئے فاتحین کے رویوں میں نمایاں فرق

دکھائی دیتا ہے، صاحب قراں بادشاہ مظلومیت کی ایک تصویر ہے۔

اس ناول میں جو منطق پیش کی گئی ہے وہ ایک نوجوان کا ذہنی خلفشار ہے جو اسے ایم۔ ہسٹری کے تحقیقی مقالے کے موضوع کی تلاش اور اپنے خاندانی بزرگ کی شناخت تک۔ پہنچانا چاہتا ہے جسے انگریز آرمی آفسروں کے قتل کے الزام میں پھانسی پر لٹکایا گیا تھا۔ اس نوجوان کا نام رحمان ہے وہ اپنی دیوانگی میں سمجھوتہ ایکسپریس پر سوار ہوتا ہے اور 1868 کے دلی ریلوے اسٹیشن پر جا اترتا ہے یہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور مظلوم مسلمانوں کی دلی ہے۔ بہادر شاہ کو وفات پائے چھ برس ہو چکے ہیں سب مصاحب اور گھوڑ سوار کہیں پس منظر میں حرکت کرتے دکھائی دیتے ہیں چوبارے میں ایک ہندو لڑکی ادائیں دکھا رہی ہے جبکہ شہزادی نور نظر ایک تاریک گوشے میں تنگ دستی کے دن گذار رہی ہے۔

اس ناولٹ کی اندرونی کہانی دلی کے زوال سے متعلق ہے۔ انیس ناگی یہاں بادشاہ کی نفسیاتی محرومیوں کی طرف اشارہ دیتے ہیں جو عمر رسیدہ ہونے کے باعث زینت محل کے ہاتھ میں کھلونا بن گیا۔ رحمان کو آخری لمحے ہم لارنس گارڈن کے ایک بنچ پر پاتے ہیں، خواب کا سفر ختم ہو چکا ہے، سنتری اسے خواب دیکھنے کے جرم میں اسیر کرنا چاہتا ہے، آوارہ گردی کا یہ سفر ذہنی غلامی کے ہاتھوں اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ یہاں خواب دیکھنے پر بھی پابندی ہے۔

محاصرہ :

یہ ناول الحمد پبلی کیشنز نے 1992 میں لاہور سے شائع کیا۔ ناول کا آغاز کچھ اس طرح ہے۔

> ''سلیم کی اس شہر میں یہ تیسری ہجرت تھی، ہر ہجرت کسی مجبوری کا فیصلہ ہوتی ہے جو بعض اوقات تاریخ کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور کبھی ذاتی انتخاب کا نتیجہ، سلیم کی پہلی ہجرت تاریخی تھی، دوسری ایک ذاتی فیصلہ اور تیسری ہجرت اس کے خاندان کے دباؤ کا نتیجہ، وہ شہر کے جس علاقے میں رہتا تھا وہاں اس کی میل ملاقات نہ ہونے کے برابر تھی، اس کے باوجود وہاں ایک طرح کی اپنائیت کا احساس تھا۔''

یہ سلیم ایک اوسط درجے کا نیم سرکاری افسر ہے مگر بیوروکریسی کی بدانتظامی سے خائف، وہ ایک مقام پر غلط کام سے انکار کی پاداش میں ملازمت سے الگ کر دیا جاتا ہے چنانچہ اس نے ایک معمولی بزنس کو ذریعہ روزگار بنایا ہے، سلیم کی بیوی آمنہ جو مشرقی معاشرے میں اپنے خاوند پر معاشی برتری رکھتی ہے، سلیم کی انانیت کے لئے ایک تازیانہ ہے۔ محاصرہ کا ایک کردار امام دین ہے جو معمولی پڑھا لکھا ہے لیکن بہت شاطر، پھر ان لوگوں کی علامت ہے جو معمولی سرکاری نوکری کے باوجود ایسے علاقوں میں جائیدادیں خرید لیتے ہیں جہاں دیکھتے ہی دیکھتے قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگتی ہیں، امام دین ناجائز دولت سے پراپرٹی کا کام کرتا ہے اور نوعمر لڑکوں کا بھی شوق رکھتا ہے، امام دین کا بیٹا نبیل ایک معاشرتی اور نفسیاتی ردعمل ہے اور امام دین کی بیوی انسانی بے بسی کی تصویر، وہ پہلے طوائف تھی پرہیزگار اور عزت دار زندگی کی خواہش میں یہ شادی کی لیکن ذلتوں سے نہ نکل سکی۔ شگفتہ کا کردار بھی اسی مجبوری کی مثال ہے۔ ''محاصرہ'' کا ایک اور کردار محمود مالی تنگیوں سے اُکتا کر ڈاکو بن جاتا ہے۔

محاصرہ کی کرداری ساخت ''خدا کی بستی'' کے کرداروں جیسی ہے لیکن بنیادی کردار سلیم کی موجودگی اس ناول کو مختلف بنا دیتی ہے۔

ناول کے اختتام پر سلیم کہتا ہے۔

''تاریک زمین کی کوکھ میں روشنی۔۔۔ یہ زمین کی نہیں، تحت الشعور کی روشنی اور سر پہ کالا آسمان'' سلیم بڑبڑایا اور بلند آواز میں ہنسنے لگا۔ میں الٹونا کا فرانز نہیں جو پوری جرمن نسل کا احساس جرم لے کر تہہ خانے سے باہر نکلا تھا، میں دوستوفسکی کا تہہ خانے کا آدمی بھی نہیں ہوں جو اپنے وجود کی تعبیر چاہتا تھا، میں تیسری دنیا کا آدمی ہوں جو خوف، بے یقینی اور نراج میں رہتا ہے۔ میں تہہ خانے میں سے نئی روشنی لے کر باہر نہیں آتا، مجھے سمجھوتے کے ذریعے زندہ رہنا چاہیے، چاہے یہ زندگی موت ہی کیوں نہ ہو، مجھے اپنی نوکری پر واپس جانا ہے ایک محفوظ نشست پر جانے کے بعد سارے جھگڑے خود بخود ختم ہو جائیں گے۔''

اسی ناول میں آخری لمحے کلاشنکوف کلچر کا آغاز ہوتا ہے۔۔۔۔فضا مزید دہشت سے بوجھل ہو جاتی ہے۔ بقول اصغر ندیم سید

''زوال پذیر فرانس اور زوال میں گرا ہوا لاطینی امریکہ جس طرح وہاں کے فکشن میں اپنی جزئیات سمیت نظر آتا ہے، انیس ناگی کے ہاں بھی زندگی کو محسوس کرنے اور اس کی بے معنویت کو فکری سطح پر تجربہ کرنے کا عمل اسی تاثیر کے ساتھ اس ناول میں سامنے آیا ہے۔۔۔اس ناول کی تعریف اس کی تکنیک ہے، ناول ایک مرکزی تار میں پھیلی ہوئی زندگی کی بے شمار شاخوں کو ایک مضبوط تنے کے ساتھ جوڑے رکھتا ہے یہ مرکزی تار سلیم کا ہے جو شروع سے لے کر آخر تک قاری کو اپنے ساتھ لے کر چلتا ہے۔۔۔محاصرہ ایک عہد کی سماجی تاریخ ہے''۔

(ایک وجودی ناول نگار،ص87,88,89)

قلعہ :

یہ ناول 1994 میں جمالیات نے لاہور سے شائع کیا، اس ناول کے بیک کور پر لکھا ہے کہ انیس ناگی کے سب ناولوں کو یکجا کر کے پڑھا جائے تو وہ ایک مربوط ایپک بن جاتے ہیں جو ہماری گذشتہ نصف صدی کے سیاسی بحران، فرد کے داخلی جہنم اور حقوق کی پامالی کا سناریو پیش کرتے ہیں جس کے نتیجہ کے طور پر ہمیں انفرادی اور اجتماعی وجود مشکوک لگنے لگتا ہے قلعہ، اسی معاشرے میں زمینوں کی آبادکاری سے متعلق ہے کہ زمین جو ماں ہوتی ہے وہ کس قدر درندگی کا شکار ہے اس کا مرکزی کردار بددیانتی کے اس قلعے کو مسمار کرتا ہوا خود منہدم ہو جاتا ہے۔ یہ شخصی نہلیزم ایک طرح سے اخلاقی نہلیزم ہے۔

انیس ناگی کا یہ ناول اعصابی تشنج، صورت حال کی بدمزگی اور شعوری افسردگی کے اوصاف کا حامل ہے۔ اس قلعہ کو علامت کی شکل دینے کے لئے مصنف نے پہلے شہر لوہ (لاہور) کی تمثیلی بساط بچھائی ہے۔ قدیم جرم و گناہ کی بستی کو پاک کرنے کے لئے نئے طاعون کی وبا کا تذکرہ کیا گیا

...۔ نیا شہر اپنے مسائل رکھتا ہے، اسے ساوات سے خطرہ نہیں بلکہ اس کے عذاب انسانی اعمال
بدبختی کا نتیجہ ہیں۔ اس کی زمین گرم اور میلی آسمان پرندوں سے خالی اور دھواں دار ہے۔ اس
ں پر بے خوابی اور اختلا کا راج ہے۔ اس فضا کے پس منظر میں ایک پچھلی مدقوق عمارت ہے جو
ں کلچر کا نمونہ ہے جہاں دن رات لوگوں کی آمد و رفت رہتی ہے لوگ اس عمارت کو قلعہ کہتے ہیں
۔ حہ کا ہیرو ایک سول سرونٹ ہے جس کا نام دارا ہے۔ وہ ایک بیگانہ اور بددماغ افسر ہے جس کا
خصی مجرد رویہ منفی جذبات پیدا کرتا ہے لوگ اس کی "فروعی دیانت" کو نفرت سے دیکھتے ہیں،
صف دارا کی زندگی کا مستقل روگ ہے۔

قلعہ کے اندر باہر خبر گرم ہے کہ قلعہ کو انسانی زندگی کے لئے خطرہ سمجھتے ہوئے گرایا جا رہا ہے،
ن لوگوں کے کاغذات ملکیت اس قلعے میں ہیں وہ پریشان ہیں، کچھ کی نظر ناجائز تجاوزات پر
ہے، خود دارا اس سوچ میں ہے کہ اس خدائی وقت میں قلعہ سے تبادلہ کرا لے۔ تاہم اس کے
ر مفاد پرستوں کے درمیان تصادم شروع ہو چکا ہے۔ مصنف اس کی ایمانداری کو شخصی
از قرار دیتا ہے۔

"دارا ایک نائب تحصیل دار کا بیٹا ہے جو ترقی کرتا کرتا اسسٹنٹ کمشنر کے عہدے پر
ریٹائر ہوا، دارا کی ماں ایک امیر عورت تھی جس کی موت کے بعد جائیداد دارا کو ملی۔ دارا
اپنے باپ کو آئیڈیلائز کرتا ہے کیونکہ اس نے ماں کی موت کے بعد دوسری شادی نہیں
کی، لیکن دارا کو اس وقت شدید دھچکا لگتا ہے جب باپ کی موت کے بعد اس پر ایک
خفیہ شادی اور سوتیلے بھائی کا راز کھلتا ہے، دارا کی جذباتی زندگی کی دوسری ناکامی محبت
میں ناکام ہونا ہے اب دارا سمجھتا ہے کہ "عورتیں محبت کے شعور سے عاری ہیں"۔

ہر انسان کی زندگی میں ایسے لمحات آتے ہیں جب اسے حتمی فیصلہ کرنا ہوتا ہے چنانچہ دارا
ب اسی فیصلے کے موڑ پر ہے ایک طرف اس کی بیوی طلاق کا مطالبہ کرتی ہے، دوسری جانب
را ملازمت سے فارغ ہو چکا ہے، مالی بحران نے گھر دیکھ لیا ہے اس کی آمدنی کا واحد
ریعہ دفتر سے ملنے والے واجبات ہیں اس میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ سابقہ ماتحتوں سے جا کر

واجبات کی وصولی کے لئے کہے۔ دارا کے لئے جب معاملات نا قابل گرفت ہوتے ہیں وہ اندرون شہر اپنی حویلی میں آتا ہے اور رہنے لگتا ہے یہیں عمر اور کالے شاہ قلعہ سے بحالیات کی فائلیں لاتے ہیں اور ان پر دارا پرانی تاریخوں پر دستخط کر کے زمین اور مکانوں کی الاٹمنٹوں کا سلسلہ چلاتا ہے، دارا کے کردار کی کایا کلپ ہو چکی ہے اب وہ ایک متشدد، خودغرض اور عیار آدمی بن چکا ہے جو اپنی کمینگی کے سہارے زندہ ہے، یہیں دارا شراب پینے کی عادت ڈالتا ہے لیکن بے خوابی اس کا مرض بن جاتی ہے، بے خوابی کے قلعے میں اسیر دارا شہر کے معمولات کا حصہ ہے اس کی سنجیدگی تمسخر میں تبدیل ہو گئی ہے اور وہ بدعنوانی کے قلعے کی ایک اینٹ میں منتقل ہو چکا ہے۔ جرم اور شرم کے احساس سے لبریز دارا اب اورنگ زیب عالمگیر بننے کی خواہش سے محروم ہے۔

جہاں کہیں مسرت اور سچائی کے پنپنے کے آثار ختم ہو جائیں اور عدم اطمینانی ہی آخری راستہ ہو انسان ہمیشہ مغائرت اور بے گانگی کا شکار ہوتے ہیں۔ انیس ناگی کے ذاتی فلسفہ کے عین مطابق دارا اسی معدومیت کا علم بردار ہے۔ ''قلعہ'' جدید عہد کے سنجیدہ ناولوں میں ایک اہم ناول ہے۔

چوہوں کی کہانی :

اس ناول کو 1995 میں سارنگ پبلی کیشنز نے لاہور سے شائع کیا۔ مصنف نے اپنے ایک مضمون ''چوہوں کی کہانی کا شخصی پس منظر'' میں لکھا ہے۔

> ''ذاتی سطح پر چوہے سے مجھے بہت کراہت آتی ہے، اگر یہ میرے کمرے میں موجود ہو تو میں سو نہیں سکتا اور جب تک اس کو کمرے سے باہر نہ نکال دوں مجھے چین نہیں آتا۔ اس ناپسندیدگی کے باوجود میرے دو تین ناولوں میں چوہوں کا ذکر ہے۔ مجھے بعض دفعہ یہ خدشہ ہوتا ہے کہ کہیں چوہا میرے پاؤں کو سوتے میں کاٹ نہ لے۔ ہو سکتا ہے یہ میرا Irrational fear ہو حالانکہ میرے بچپن میں چوہے دور دور تک موجود نہیں رہے۔ نہ جانے کس طرح لاشعور میں چوہے اچھل کودتے رہے ہیں۔

بہت سال پہلے جب کامیو کا ناول "پلیگ" کا پینگوئن ایڈیشن لاہور میں پہنچا تو میں نے بڑے اشتیاق سے اسے خرید کر پڑھا اور مجھے یہ ناول اچھا لگا۔"

چنانچہ مصنف کے ناول کے اختتام پر یہ اعتراف اس طرح سے ظاہر ہوتا ہے۔

"میرے کمرے کا ٹیبل لیمپ جل رہا ہے، مجھے کمرے کے کسی گوشے سے کھڑکھڑاہٹ سنائی دی ہے میں ایک دم چوکنا ہو گیا ہوں اور میری متلاشی نگاہیں کمرے میں ادھر ادھر گھوم رہی ہیں، آخر میں اس شور کی وجہ جاننے میں کامیاب ہو گیا ہوں سامنے ایک ننھی سی چوہیا ایک پرانی سی کتاب کو تیزی سے کتر رہی ہے، میں نے آگے بڑھ کر ہاتھ سے اشارہ کیا ہے چوہیا تیزی سے نیچے اتر کر آتشدان کے اندر گھس گئی ہے میں نے آتشدان پر سے کتاب اٹھا کر دیکھی ہے یہ کامیو کا ناول "طاعون" ہے، جس کا ایک حصہ چوہا کتر گئی ہے۔" (چوہوں کی کہانی، فصیلیں، ص 317)

یہ ناول کارپوریشن کے ایک ریٹائرڈ ملازم کے گرد گھومتا ہے جو پاکستان سے باہر جانے کی ومتی اجازت کے بغیر ہندوستان کے شہر سورت جا پہنچتا ہے۔ یہاں پولیس اسے پکڑ لیتی ہے اور بد کر دیتی ہے (ایسی ہی صورت حال ہمیں مصنف کے ناول ایک لمحہ سوچ کا میں بھی متعارف رائی گئی تھی) سورت کے تاجر، حکمران اور سیاست دان طاعون سے بھی مفاد وابستہ کئے ہوئے ں۔ پاکستانی ہونے کی وجہ یہ ان کا آسان ہدف ہے، طے یہ پاتا ہے کہ اس شخص میں طاعون کے اثیم انجیکٹ کر کے یہ واویلہ مچایا جائے کہ یہ طاعون پاکستان نے بھارت میں دانستہ بھیجا ہے، مگر کمز شنکر یہ تجربہ کرنے سے انکار کر دیتا ہے، ناول کا ہیرو بخیر و عافیت پاکستان واپس آ جاتا ہے، ہاں بھی کم و بیش اس سے ہتک آمیز سلوک کیا جاتا ہے اور قید تنہائی میں رکھا جاتا ہے۔

"میں سمجھوتا ایکسپریس سے اترا تھا تو میرے ساتھ کون سا اچھا سلوک کیا گیا تھا، مجھے چند روز قید تنہائی میں رکھا گیا تھا چونکہ میرا وزن کم ہو گیا تھا تو علیحدگی کے وارڈ کے لوگ پولیس کے آدمی مجھے چوہا کہہ کر پکارتے"

ایک اور مقام پر درج ہے

''تیسرے دن مجھے کوٹھری سے باہر نکال کر ایک سفید پوش انسپکٹر کے روبرو پیش کیا گیا۔۔۔
میں نے اضطراب سے کہا۔

''جناب مجھے طاعون نہیں ہے میرا معائنہ ہو چکا ہے۔۔۔۔ میں ادھر سیر و تفریح کے لئے گیا تو وہاں بھی دس پندرہ دن میری تفتیش کی گئی مجھے ہسپتال میں رکھا گیا واپس آیا تو یہاں بھی میری تفتیش کی جا رہی ہے۔۔۔۔ میں ایک عام آدمی ہوں۔''

''تم کمیونسٹ لگتے ہو یا تمہارے ذہن کی وہاں کافی صفائی کی گئی ہے ہمیں سب پتہ ہے۔'' (فصیلیں، ص308)

محسوس ہوتا ہے سمجھوتہ ایکسپریس کی موجودگی بھی دونوں ممالک کے ذہنی شکوک کا خاتمہ نہیں کر سکی، سرحدوں کی لکیر بظاہر ثقافت اور تمدن کی تخصیص اور تحفظ کے لئے کھینچی جاتی ہے لیکن یہ انسانی آزادی کے دائروں کو محدود کر کے جوہڑ میں تبدیل کر دیتی ہے۔ میونسپل کمیٹی کے ریٹائرڈ ملازم اور سورت کا ڈاکٹر شنکر انفرادی سطح پر عوامی ذہنیت کے غماز ہیں جو ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں لیکن انتظامی سطح پر دونوں ممالک کے اجارہ دار شک کی لکیر کو مضبوط بنانا چاہتے ہیں۔ ہم ایک صورت حال میں 313 بریگیڈ کے پارسی ہیرو کے ہاں بھی دیکھتے ہیں۔ جو شک کی بنا پر واپس پاکستان نہیں آتا البتہ اپنے بھائی کے پاس بمبئی پہنچ جاتا ہے۔

یہ ناول تیسری دنیا کے معاشرتی نظام کا ایک المیہ ہے جہاں لوگ بے سمتی کی طرف دوڑے چلے جا رہے ہیں، طاعون کا نفسیاتی چوہا آہستہ آہستہ انسانی زندگی اور اس کی تعلقات کی کتاب کتر رہا ہے۔

مصنف نے لکھا ہے کامیو کے ناول ''پلیگ'' کے ترجمہ میری ناول کے سیکھنے کی مشق تھی، اس کا مجھے احساس تب ہوا جب میں ''چوہوں کی کہانی'' کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت میں مصروف تھا، پبلشر کی فرمائش تھی کہ ناول کی ضخامت زیادہ کی جائے۔۔۔۔ میں نے کامیو سے کم سے کم ایک دو باتیں ضرور سیکھی ہیں کہ ناول کو اندر سے کھینچ کر رکھنا چاہیے اور ہر طرح کی خارجی تفصیلات سے ممکن حد تک اجتناب کرنا ضروری ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ حقیقت نگاری کا اسلوب

استعمال کرتے ہوئے اسے کس طرح معنی کی مختلف سطحیں پیدا کرنے کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔۔۔کامیو کے ناول طاعون اور میرے ناول ''چوہوں کی کہانی'' میں چوہوں کے سوا کوئی قدر مشترک نہیں۔۔۔۔میں نے جس طاعون کا ذکر کیا ہے وہ اصلی ہے، چند برس ہوئے ہندوستان کے شہر سورت میں طاعون کی وبا پھیلی تو وہاں سے لوگوں کا انخلاء شروع ہو گیا، ادھر پاکستان میں انتظامیہ بھی حرکت میں آ گئی اور دھڑا دھڑ دونوں ملکوں نے خبریں لگانی شروع کر دیں، سمجھوتہ ایکسپریس کو بند کر دیا گیا، ہندوستان کے فسطائی لیڈروں نے شور مچایا کہ پاکستانی آئی۔ایس۔آئی کے ذریعے ہندوستان میں مردہ چوہے بھیج رہا ہے۔۔۔۔

طاعون کا لفظ بذات خود بہت بڑی دہشت ہے جبکہ طبی نقطہ نظر سے یہ ایک عام سی وبا ہے۔جب میں نے دونوں طرف سے شائع ہونے والی خبروں اور بیانات کا تجزیہ کیا تو پھر مجھے ہسٹریا کا احساس ہوا جو دونوں طرف موجود تھا۔۔۔یہ کوئی Gimmi نہیں اور نہ ہی زولا ایسی حقیقت پسندی اس کا مقصد یہ بتانا ہے کہ ہمارے اخبار بعض اوقات دہشت گردوں کا منصب بھی ادا کرتے ہیں۔

(ایک وجودی ناول نگار، ص106)

مصنف ڈاکٹر شنکر اور کارپوریشن آفیسر دونوں کی موجودگی کو دو دنیاؤں کا روحانی سفر قرار دیتا ہے، اس کے نزدیک بزدلی، بے شناختی اور عدم وجودیت اس کائنات کے ہر ذی روح کی قسمت ہے، یہ سیاسی، ثقافتی، انفرادی اور فکری طاؤن مظلوم دنیا کے انسانوں کی تاریخ ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر کا خیال ہے۔

> ''سیدھے سبھاؤ میں قلم بند کئے گئے اس ناول میں انیس ناگی نے خاصی فن کاری دکھائی ہے، مثال کے طور پر طاعون کا تاثر قائم کرنے کے لئے خبروں کی سرخیوں کا استعمال، کامیو کی لاعون سے اقتباس جبکہ کامیو کے پلیگ زدہ شہر ''اوراں'' کا تذکرہ اور سیاحت حاشیے میں ہے جس سے مجھے امریکہ میں مقیم روسی ناول نگار نبوکوف کا ناول Pale Fire یاد آیا جو حاشیے میں تکمیل پاتا ہے''۔(چوہا دوڑ۔۔۔ایک وجودی ناول نگار، ص96)

کامیو کے ناول طاعون اور انیس ناگی کی ''چوہوں کی کہانی'' پر کافی عرصہ مباحثے جاری رہے

اور ناول کی کرافٹ کو سراہا گیا۔

تاہم مصنف سے یہیں ایک سوال پوچھا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنے فکر انگیز ناولوں کی کرافٹ میں فینٹسی یا خیال وشعور بلکہ خواب آوری کا جو تجربہ کیا ہے کہانی کے اختتام پر اسے "فارس" میں تبدیل کرنا کیوں ضروری سمجھا گیا ہے؟

کیمپ:

یہ ناول جمالیات نے 1998ء میں شائع کیا۔ اس ناول کو افغان مہاجرین کے کیمپ کے تناظر میں لکھا گیا ہے، یہ پلاٹ اس وقت استوار کیا گیا جب مصنف کو کمشنر افغان مہاجرین کی حیثیت سے سرکاری خدمات انجام دینے کا موقع ملا۔

کہانی میں دو منظر نامے قابلِ توجہ ہیں، پہلا منظر نامہ تو مصنف کے پسندیدہ شہر لاہور کی بساط پر بچھا ہے، مصنف نے لکھا ہے۔

"اس شہر کے تیرہ تاریخی دروازوں میں اب چند ایک باقی رہ گئے ہیں جن کی تعمیرِ نو انگریزوں کے عہد میں کی گئی تھی۔ لوہاری دروازے کی محراب پر اب بھی ایک بجھا ہوا کتبہ نصب ہے۔ جس پر اس ڈپٹی کمشنر کا نام بھی درج ہے۔ جس نے پچھلی صدی میں اس کی مرمت کرائی تھی۔۔۔"

یہیں ہمیں فٹ پاتھ پر کپڑے بچھائے لوگ کم قیمت اشیا فروخت کرتے نظر آتے ہیں انہیں دیکھ کر ایک کردار سوال کرتا ہے۔

"اتنے افغانی کہاں سے آ گئے ہیں"؟

یہیں سے مصنف ایک سست رو ٹرک سے گذرتے ہوئے دشوار گذار رستوں کے اختتام پر "کاف" بستی جا پہنچتا ہے، کاف بستی سے ایک چھوٹی سڑک ضلع بنوں کی طرف جاتی ہے، شہر سے کافی فاصلے پر ایک مرتعش ٹوٹا ہوا بورڈ لگا ہے "کیمپ"۔۔۔ کیمپ کے بارے میں الٹی سیدھی باتیں مشہور ہیں، رات کو پولیس گشت کرتی ہے لیکن مشکوک لوگوں کو حراست میں لینے سے قاصر ہے،

مہاجرین نے اپنی بہتری اور دفاع کا ایک نظام بنا رکھا ہے، لیکن سرکاری سطح پر کوئی خاص منصوبہ زیرِ غور نہیں اس لئے کیمپ کا عملہ اکثر بیکار رہتا ہے اور دیارِ غیر سے آئی ہوئی امداد کو اپنی تنخواہ کی صورت توڑتا ہے اس کیمپ کا انچارج میجر قربان ایک ریٹائرڈ فوجی جس سے سب ڈرتے ہیں۔

یہ میجر قربان ہی انیس ناگی کے ناول کا ہیرو ہے جو جانتا ہے کہ پٹھان ردِعمل کا اظہار نہیں کرتے بلکہ نہایت پراسرار ہوتے ہیں اور ہر فیصلہ مل کر کرتے ہیں، میجر قربان ایک بیرک نما دفتر میں رہتا ہے، وہ ایک عام سا آدمی ہے جس کا باپ اسے پنساری کی دکان پر بٹھانا چاہتا تھا اس نے ایم۔ اے کیا اور پھر فوج میں کمیشن حاصل کیا۔ وہ اپنی عمر کے تیس برس گذار چکا ہے اس کے ساتھی فوجی اس کے تجرد پر ہیں۔

گذشتہ سولہ برس سترہ برسوں میں کیمپ کی زندگی میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی، مہاجر اس انتظار میں ہیں کہ کبھی اپنے وطن لوٹیں گے، اس کیمپ میں رہتے رہتے میجر کے ذہن میں رانچی کیمپ کے وہ دن آتے ہیں جب وہ مشرقی پاکستان کے محاذ سے قید ہو کر ہندوستان جا پہنچا تھا، اب وہ دوسروں کے لئے اس کیمپ کو اپنی قید کی تکلیف دہ باتوں میں تبدیل نہیں کرنا چاہتا، اچانک علاقے کے لوگوں اور کیمپ کے مہاجرین میں ٹھن جاتی ہے مکالمہ ابھرتا ہے۔

"میجر صاحب ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں، آپ کو ہماری تعداد اور طاقت کا علم نہیں ہے ہم جلسہ جلوس بھی کر سکتے ہیں، ہم مسلح بھی ہیں، ہم دارالخلافہ بھی جا سکتے ہیں لیکن ہم مہاجرین ہیں ہم ایسا نہیں کریں گے۔۔۔ ہم بے وطن ہیں، دوسروں کی خیرات پر زندہ ہیں" (ص۔365)

اسلحے کی آمد و رفت، خرید و فروخت شروع ہو چکی ہے، قندھاری خان عروج پر ہے۔ آبادی سے بچے اغواء کر کے تاوان وصول کیا جا رہا ہے، بین الاقوامی وفود کیمپ کا دورہ کر رہے ہیں، ہسپتال بنایا جا رہا ہے، وبائیں پھیل رہی ہیں۔

آہستہ آہستہ کیمپ کی آبادی دو لاکھ سے کم ہو کر بیس ہزار رہ گئی ہے، میجر کیمپ سے چھٹکارا چاہتا ہے لیکن کوئی صورت نہیں نکلتی، وہ کبھی استعفے کی درخواست لکھتا ہے۔ کبھی خودکشی کے بارے میں

سوچتا ہے کیونکہ کیمپ میں اسے جان کا خطرہ محسوس ہونے لگا ہے۔ اس خطرے کی بڑی وجہ دلاری کی محبت ہے، آخر میجر موٹر بوٹ کے ذریعے دریا پار کرنے کی کوشش کرتا ہے، نفسیاتی دباؤ کے تحت وہ فائرنگ کرنے لگتا ہے اور پھر کچھ دنوں بعد یہی موٹر بوٹ جھاڑیوں میں پھنسی ہوئی ملتی ہے۔ جس میں میجر قربان کی خون میں ڈوبی اکڑی ہوئی لاش موجود ہے، بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ میجر نے نفسیاتی دباؤ کے تحت کلاشنکوف سے خودکشی کر لی لیکن وہ لوگ جو کیمپ کے حالات سے واقف تھے ان کا خیال تھا کہ میجر قربان کو قتل کر دیا گیا۔

ناول کے آخری باب میں ایک بار پھر سوال اٹھتا ہے۔

''کاکا اتنے مہاجر کہاں سے آ گئے، پچھلے ہفتے تو اتنا ہجوم نہیں تھا'' (ص 405)

اگلا فقرہ کچھ اس طرح ہے۔

''ہم سب مہاجر ہیں، ہم نے بھی تو ایک اور زمانے میں ہجرت کرنی ہے''

اس ناول پر بھی کافی لے دے ہوئی اور طرح طرح کے تبصرے کئے گئے تاہم افغان مہاجرین کے بارے میں کم از کم اردو ادب میں اس سے بہتر ناول نہیں لکھا گیا، خاص طور پر بنگلا دیش کی فضا کو میجر قربان کی شکل میں دہرانا اور پھر فوجی اور سویلین مہاجر کیمپوں کا تقابل بذاتِ خود ایک مشکل تجربہ ہے۔

مصنف کو اس ناول پر 1998ء میں وزیر اعظم ادبی ایوارڈ عطا کیا گیا۔

پُتلیاں :

یہ ناول 2003ء میں جمالیات نے شائع کیا، یہ ناول وجودی احساسات کے لئے خاص اہمیت کا حامل ہے جس میں مصنف ایسے کردار متعارف کرا رہا ہے۔ جن کا تعلق تیسری دنیا سے ہے اور جو بے رحمیوں اور سفاکیوں کا شکار ہو کر اپنے آپ سے اور معاشرے سے بیگانہ ہو گئے ہیں۔ اس بے معنویت کی آخری منزل موت ہے۔

اس ناول میں بظاہر ایک خاندان کی ٹوٹ پھوٹ کا تذکرہ ہے۔ جس کے سربراہ کا نام جمیل

ہے۔اس کی بیوی پروین، بیٹا امجد اور بیٹی رابعہ اس یونٹ کا حصہ ہیں، جمیل بلند آدرش رکھتا ہے مگر
ں کے ماحول میں ان خیالات کی کوئی گنجائش نہیں، اپنے کیریئر کا آغاز وہ مصنف کی طرح لیکچرر
شپ سے کرتا ہے مگر استعفیٰ دے کر اخبار کی ملازمت کرتا ہے۔ جہاں اسے زندگی کے نشیب و فراز
سے براہِ راست نپٹنے کا موقع ملتا ہے۔ اور وہ نتیجہ اخذ کرتا ہے" حالات انسان کو نیک یا بد بناتے
ہیں" اسی ربط کے دوران اس کا کچھ لوگوں سے ربط بڑھتا ہے جن میں علی اور شہباز یکے بعد
دیگرے قتل ہو جاتے ہیں۔ تیسرا کردار راحت کا ہے جو جمیل کی محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے اور پھر
حالات سے تنگ آ کر خودکشی کر لیتی ہے۔ جمیل ایک لایعنیت کا شکار ہوتا ہے اور اپنے گھر والوں
سے لاتعلق رہنے کے بعد خودکشی کا فیصلہ کرتا ہے۔

"اگر انسان جذباتی موت کے بعد زندہ رہنے کی خواہش رکھتا ہے تو یہ تضاد میں رہنا
ہے یا بزدلی۔۔۔ میری غیر حاضری کا کسی کو رنج نہ ہوگا میں تو غیر حاضری میں ہی
زندہ رہا ہوں۔۔۔ میرا اصل تو کہیں اور تھا"۔

اس ناول میں نوجوانوں کا ایک گروہ جو ڈاکٹرز اور انجینئرز ہیں بے روزگاری کے ہاتھوں
سوسائٹی کے ہاتھ میں پتلی بنا ہوا ہے۔ یہ نوجوان جلد از جلد امیر ہونا چاہتے ہیں یا امریکہ کی شہریت
حاصل کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔

کہانی میں باپ بیٹے کا تصادم بھی نئی اور پرانی نسل کے احساسات کو سامنے لاتا ہے دونوں
نسلیں اپنے موجود پر قانع نہیں اور آپ کو بدلنے پر بھی قادر نہیں ہیں۔

"سب کچھ بیت چکا ہے، میں اپنی ذات کی ذمہ داری بھی قبول نہیں کر سکا اور زندگی
کو ایک پتلی کی طرح بسر کیا، جس کا اختیار کسی اور کے ہاتھ میں تھا" (ص18)

"پتلیاں" میں خواتین کے کردار بھی قابلِ توجہ ہیں، وہ اپنی موجودگی کی عدمیت کا شکار ہیں،
پروین اور راحت کے علاوہ نرگس بھی وجودیت کے مرض میں مبتلا ہے۔

"میں جو کچھ ہوں، وہ میری مجبوری کا روپ" (ص20)

راحت کہتی ہے۔

''میں اپنے انتخاب کا خود المیہ ہوں'' (ص21)

انتخاب کا یہ عذاب آخر تک چلیوں کے تصورات میں اپنی موجودگی کا پتہ دیتا ہے لیکن ان نادار لوگوں کی زندگی شہر محرومی کی قلبی زندگی سے گذرتے ہوئے ایک ناختم ہونے والی پیاس میں ڈھلتی جاتی ہے۔ ہم زمانیت اور ہم عصریت کی اس فضا کی بنیاد بداعتمادی پر رکھی گئی ہے۔ جہاں ہر دوسرا شخص ایک جہنم ساتھ لئے پھرتا ہے۔

ناراض عورتیں:

یہ ناول 2004ء میں جمالیات نے شائع کیا۔

''ناراض عورتیں'' کیلئے ایک طویل خود کلامی کی تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ یہ ناول بنیادی طور پر ایک صحافی فوٹو گرافر شاہ صاحب کی کہانی ہے جو ایک غیر ملکی این جی او کے لئے عورتوں کے بارے میں ایک دستاویزی فلم بنانا چاہتا ہے، اس فلم کے حوالے سے کئی نسوانی کردار سامنے آتے ہیں۔ شاہ صاحب خود نفسیاتی عارضے میں مبتلا ہیں، انہوں نے مجرد رہنے کا فیصلہ کیا ہے جسے وہ تصوف کا نام دیتے ہیں، ناول کے اختتام پر کھلتا ہے کہ دستاویزی فلم کی آڑ میں ایک نفسیاتی بریک ڈاؤن کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ موصوف شاہ صاحب کو ڈائری لکھنے کی عادت ہے اور ناول میں آنے والے سب کردار ان کے تصورات کی پرچھائیاں ہیں۔

ناول کا ایک کردار عبدل اپنے آپ کو عورتوں کی دنیا کا پارکھ سمجھتا ہے اور اپنی جسمانی خواہش کے ہاتھوں ایک کے بعد دوسری عورت کی طرف راغب ہوتا ہے جبکہ اس کے دوست فوٹو گرافر شاہ صاحب صوفی بھی ہیں اور مجرد بھی، کسی کسی وقت احساس ہوتا ہے دونوں کردار ایک ہی کردار کے مختلف روپ ہیں۔

اس دستاویزی فلم میں پہلے کالج کی طالبات آتی ہیں، دو لڑکیوں کی مختصر جھلکیاں، ایک شوخ و شنگ دوسری ڈری سہمی کبوتری، کہیں کہیں اشارے کنائے بھی موجود ہیں۔ احساس ہوتا ہے کہ عورتوں کا دبا ہوا اور ڈرا ہوا رویہ آدمی کے ٹکراؤ سے ظلم یا تشدد میں تبدیل ہوتا ہے۔ عتیقہ اور عبدل، عرفان اور

ڈاکٹر کی بہو اس کی مثال ہیں۔

شمسی کے بیوٹی پارلر سے ہوتا ہوا فوٹو گرافر قحبہ خانے تک جا پہنچتا ہے۔

انیس ناگی نے جن عورتوں کو ناول میں شامل کیا ہے وہ سب کی سب ناراض ہیں۔ کوئی معاشرے سے، کوئی خاندانی نظام سے، کوئی اپنے آپ سے، کسی کو اپنے عورت ہونے پر ناراضگی ہے کیونکہ اسے آدھی مخلوق سمجھا گیا ہے، مصنف نے جن عورتوں کو ناول میں متعارف کرایا ہے۔ وہ زیادہ تر متوسط یا نیم متوسط طبقے سے تعلق رکھتی ہیں۔ محنت کش اور خواندہ عورتوں کے بارے میں مصنف کی معلومات کمزور ہیں، انیس ناگی بنیادی طور پر مرد اور عورت کی محبت پر یقین نہیں رکھتے اور وہ اس محبت کی بنیاد صرف جسمانیت پر ہی رکھنا چاہتے ہیں۔ کئی لحاظ سے یہ ایک کمزور ناول ہے اور اس کی زنانہ فنٹیسی ایک ایسے کردار کے تصور سے باندھی گئی ہے جو ایک مجرد زندگی بسر کر رہا ہے، ''زن بیزاری'' کے تصورات کہیں نہ کہیں فوٹو گرافر شاہ کی ذاتی نفسیات میں تلاش کیے جا سکتے ہیں۔

313 بریگیڈ :

یہ ناول 2007ء میں جمالیات نے شائع کیا، اس کا موضوع بین الاقوامی دہشت گردی ہے، شاید اس موضوع پر یہ پہلا اردو ناول ہے جس میں بغیر کسی تعصب کے دہشت گردی کی وجوہات پر غور کیا گیا ہے، ناول میں انسانی موجودگی، دہشت گردی کے جواز، پاکستانی معاشرے کی بگڑتی صورت حال اور خوف کی نفسیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

کہانی کا ہیرو فریدوں ایک پاکستانی پارسی ہے جو انٹرنیشنل نیوز ایجنسی میں ملازم ہے، ادارے کی جانب سے اس کی ڈیوٹی لگائی گئی ہے کہ وہ دہشت گردی کے ایک مقدمے کے فیصلے کی کوریج کرتے ہوئے القاعدہ اور بریگیڈ 313 کے بارے میں مکمل معلومات فراہم کرے، فریدوں اس کام کی غرض سے لاہور سے نکلتا ہے اور شمالی علاقہ جات کی جانب روانہ ہوتا ہے جہاں اسے دہشت گرد ہونے کے شبے میں امریکن فوجی قید کر لیتے ہیں اور آخر کار اذیتیں سہنے کے بعد وہ اپنے

بھائی کے پاس پہنچ جاتا ہے۔

313 کی تمثیل جہادی نقطۂ نظر سے جنگ بدر کی طرف بھی اشارہ دیتی ہے یہ فوج کے مخصوص دستے کا نام بھی ہے، اس ناول میں 313 کی موجودگی خودکش حملے کے ساتھ مخصوص کی گئی ہے، مصنف نے عصری صورت حال اور تاریخی واقعات کو اچھے طریقے سے اکٹھا کیا ہے۔ فریدوں۔ کے، پارسی ہونے کا اشارہ بھی معنی خیز ہے۔ ناول کے آخر پر فریدوں کی نظموں کی موجودگی بھی معنی خیز ہے۔

اب زوال پذیر خطوں میں
ہم احتجاج کی حکمت عملی ترک کر کے
اور ان تمام خوابوں کو سانس کے ریلے سے منتشر کر دیں گے۔
جو ہم نے سوتے جاگتے میں دیکھے تھے۔
ہم اپنے آپ کو بھی مسترد کر دیں گے۔

یہ ناول ایک سوال ہے دہشت، دہشت گردی اور دہشت گرد کی تثلیث سے۔ مزین ڈاکٹر سلیم الرحمان کا کہنا ہے۔

'313' بریگیڈ انیس ناگی کی فکشن کی نئی کتاب موضوع اور تکنیک کے اعتبار سے ایک منفرد حیثیت کی حامل ہے، روایتی اصولوں کے مطابق اسے ناول نہیں کہا جا سکتا، اس پر رپورتاژ کا شائبہ ہوتا ہے۔ اس میں متنوع تکنیکی طریقے استعمال کئے گئے ہیں ، جن میں خودکلامی، ڈائری رائٹنگ، بیانیہ اور داستان شامل ہے۔ میری نظر میں اردو میں اسی تکنیک میں لکھے گئے ناول نہیں گذرے اس لحاظ سے انیس ناگی نے اس ناول میں احساس کی ایک نئی سطح دریافت کی ہے''۔ (ص 209) نئے ادب کا معمار)

فصیلیں کی چو مکھی :

انسانی فکر ہمہ وقت مکمل کامیابی کے حصول کے لئے اپنے آپ کو نئے سرے سے اکٹھا کرنے کی کوشش میں مبتلا رہتی ہے، لکھنے والا جب بھی کوئی نیا حیرت کدہ دریافت کرتا ہے اس کی ملاقات

یک اور اجنبی جزیرے سے ہوتی ہے، اس مسلسل تلاش و جستجو کی آنکھ مچولی میں صرف ایک چیز کی موجودگی استقلال پذیر ہے اور وہ ہے خود مصنف جو ہمیشہ ایک لازوال شک میں مبتلا رہتا ہے، یہی شک جو اس کی موجودگی کے یقین کا ثمر ہے اسے مسلسل چلتی ہوئی کہانی کو بار بار "ری وائنڈ" کر کے دیکھنے کے عمل پر اکساتا ہے۔

2005 میں انیس ناگی نے اپنے چار ناولوں کو اکٹھا کر کے نئے عنوان کے تحت نئے سرے سے انہیں پڑھنے اور پڑھانے کا تجربہ کیا، مجموعے کا نام فصیلیں رکھا گیا، اس میں موجود ناولوں کی ترتیب کچھ اس طرح ہے۔

1۔ قلعہ 1994

2۔ چوہوں کی کہانی 1995

3۔ کیمپ 1998

ایک گرم موسم کی کہانی 1990، اس کتاب کو جمالیات نے شائع کیا ہے اس کا دیباچہ سلیم شہزاد نے لکھا ہے اور ان کا کہنا ہے

> "انیس ناگی ایک غیر معمولی تخلیقی صلاحیت کے حامل دانشور ہیں۔۔۔ان کے تمام ناولوں کو مربوط کر کے پڑھنے کی ضرورت ہے، کیونکہ یہ ناول تیسری دنیا کے ایک بہت بڑے ایپک کو سامنے لاتے ہیں۔"

مصنف کی جانب سے ناولوں کی یکجائی کی کوئی وجہ بیان نہیں کی گئی، تاہم اس کے قارئین یہ پوچھنے کا حق محفوظ رکھتے ہیں کہ اس برسوں میں کتنا فاصلہ طے ہوا اور ابھی منزل کتنی دور ہے، یہیں ہم مصنف کے ایک کردار بیان کی طرف لوٹتے ہیں۔

> "میری سرگذشت چلتے چلتے رک گئی ہے کیونکہ اس میں واقعات کی کمی ہے"۔

(چوہوں کی کہانی)

> واقعات کی کمی کی بڑی وجہ وہ شہر قدیم ہے جو مصنف کے اظہار و خیالات کی جولان گاہ ہے جسے "نہ تو بنایا گیا ہے نہ گرایا گیا ہے" اسی نیم تخلیقیت کے باعث شہر اور اس

کے رہنے والوں کی کیمسٹری بدل گئی ہے،ان سب ناولوں کے ہیرو اگرچہ مختلف ہیں لیکن ایک مشترک گھٹن کا شکار ہیں۔قلعہ کا دارا کرپشن اور انٹی کرپشن کے مابین کھڑا ہے، چوہا کہانی کا میونسپلٹی آفیسر ناداری کی زندگی بسر کرتے ہوئے سوچتا ہے "حملہ آور ایک طرح کی وبا ہوتا ہے، اس کے جراثیم پھیلتے پھیلتے ایک نسل سے دوسری نسل تک جا پہنچتے ہیں ۔۔ مغل بھی طاعون کی ایک قسم تھے پھر کیپٹن ہاکنز تحفے کے طور پر جہانگیر بادشاہ کے لئے سفید چوہے لایا، ہمارے چوہے سیاہ اور سرمئی ہوتے ہیں، جہانگیر چوہوں کا پنجرہ دیکھ کر بہت خوش ہوا" ۔(ص249)

اسی چوہا گھر میں جہاں دیسی چوہے پھدک رہے ہیں قحط اور طاعون اپنا کام کر رہے ہیں اور خلق خدا اندرونی اور بیرونی حملہ آوروں سے خوف زدہ ہے 1998 کے فکری سفر میں افغان کیمپ سے برآمد ہونے والے مارشل لائی نظام کے متروک ہیرو میجر فرمان کا قتل شخصی انتخاب یا خودکشی ہے۔

ناولوں کی اس چوکھی کا خاتمہ اگر تاریخی اعتبار سے کیا جاتا تو مصنف اپنے مطلوبہ نتائج حاصل کرنے سے قاصر رہتا ہے چنانچہ کتاب کی آخری فصیل "ایک گرم موسم کی کہانی" ہے جسے 1990 سے تحریر کیا گیا تھا۔ منطقی اعتبار سے مصنف نے ہلکا سا اشارہ دے دیا ہے کہ ہمارا سفر آگے کی طرف نہیں پیچھے کی طرف ہے اور منزل کی بے مرکزیت اس سفر کا آخری پڑاؤ ہے۔

"فصیلیں" کی چاروں کہانیاں مملکتِ خداداد کی اسٹبلشمنٹ اور سیاسی وعسکری آویزش کی تصویر ہیں، بے شک اناج کی فراوانی چوہوں کی ابدی موجودگی کا استعارہ ہے۔" (ص263)

یقیناً حروفِ تہجی کے ممنوعہ الفاظ سے اپنے خیالات کی تعمیر وتشکیل اور سماج سدھار کی خواہش میں مبتلا مصنف ایک وعدہ آئندہ پر زندہ ہے لیکن کبھی کبھی زندگی اپنے دوہرے پن Doubleness کے ساتھ ایک سوال پوچھتی ہے کہ ایسا ممکن ہے۔

کہ ہم اڑتے رہیں

دیر تک

ایک سفید پر کے ساتھ؟؟؟

انیس ناگی کی افسانہ نگاری

حکایات :

افسانوں کا یہ مجموعہ انیس ناگی کے اس نظریے کی جانب اشارہ دیتا ہے جب 1960 کی دہائی میں نئی شاعری کی طرح نئے افسانے کی بھی اصطلاح استعمال کی گئی، ان افسانوں کو انحرافی، تجرباتی ور کثیر المعانی تحریر کے طور پر متعارف کرایا گیا، اس فہرست میں انتظار حسین، انور سجاد، سمیع آہوجا، احمد ہمیش، ذکاء الرحمٰن، منشا یاد، مظہر الاسلام، رشید امجد، خالدہ حسین، احمد داؤد، اعجاز راہی اور دوسرے افسانہ نویس شامل تھے۔ اپنی دیگر ادبی مصروفیات کے مقابلے میں انیس ناگی افسانے کی جانب ذرا دیر سے متوجہ ہوئے اور کوشش کی یہ متذکرہ افسانہ نگاروں کی موجودگی میں افسانے کو نئے عصری تقاضوں اور عصری حسیت سے متعارف کرائیں۔ 1976 کے قریب وہ اس صنف کی جانب سنجیدگی سے بڑھے اور 1982 میں حکایات کے عنوان سے یہ پہلا مجموعہ شائع ہوا۔ اس مجموعے میں سات حکایات اور تین تمثیلیں شامل ہیں انہیں ریئلسٹک اسلوب میں تحریر کیا گیا ہے۔

دراصل یہ حامد کی کہانیاں ہیں، حامد کی آٹو بائیوگرافی، اس کے دفتر، گھر، سماج اور ذات کے مسائل، حامد نہ تو کوئی سیاسی ہیرو ہے نہ ہی قومی رہنما، نہ وہ سماجی کارکن ہے کہ مشہور و معروف ہو، نہ ڈارزن ہے نہ سکس ملین ڈالر مین ان افسانوں میں ہیرو کا پرانا تصور موجود نہیں، بے معنی زندگی گذارنے والا شخص جو فکر و شعور کی دولت سے مزین ہے ہیرو بننے کا جواز چاہتا ہے، حامد ہمارے دفتری نظام کا ایک پرزہ ہے جس نے شعور کی گود میں آنکھیں کھولی ہیں، ان حکایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہفتے کے سات دنوں کے پھیر میں ہے، وہ مکمل طور پر ماضی کے دائرے میں رہتا

چاہتا ہے، وہ مسائل کا حل تلاش کرنے سے معذور اور امید کی روشنی سے بے بہرہ ہے۔ اس کا پیشہ ہے کہ وہ سچ کو جھوٹ سے الگ کرے لیکن وہ سوچتا ہے "سچ اور جھوٹ بھی تو افسانوں نے بنائے ہیں" وہ دوسروں کے حقوق کے فیصلے کا حق رکھتا ہے اور اپنے حق سے محروم ہے۔ حامد کے لئے زندگی ایک مسلسل ایمرجنسی ہے۔ مجبوری کے فیصلوں میں گھرے ہوئے وہ اعتماد و اعتقاد کی دولت سے ہاتھ دھو چکا ہے۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتا کہ سڑک کے دائیں جانب چلنا ہے یا بائیں جانب وہ سڑک کے وسط میں چل رہا ہے اور پیچھے کاریں اور رکشے مسلسل ہارن دے رہے ہیں وہ ایک متذبذب شخص ہے جو جنسیت اور بے دلی کا شکار ہے۔

حامد معاشرے میں موجود مقصد برآری، دوسروں کی تحقیر اور فسطائیت کے رجحانات کی وجہ سے ہابیل و قابیل کی حکایت کو پہچاننا چاہتا ہے اور تشویش میں مبتلا ہوتا ہے، وہ اس صورت حال سے تنگ آ کر استعفیٰ دینا چاہتا ہے لیکن اس کا استعفیٰ منظور نہیں ہوتا اس طرح وہ سسی فس کی طرح ہر روز ملازمت کے جبر کا پتھر ڈھوتا ہے وہ خودکشی کے امکانات پر غور کرتا ہے اور اپنے آپ کو فالتو سمجھتا ہے۔

حکایات میں تین تمثیلیں بھی ہیں، پہلی اور آخری تمثیل حامد کو درپیش مسائل کی عکاسی ہے دوسری تمثیل ایک عورت کی فطری جسمانی خواہش کے آشوب کو ظاہر کرتی ہے۔

خودکلامی کی تکنیک میں لکھے گئے یہ افسانے فلسفیانہ مزاج رکھتے ہیں ہم انہیں وارداتی افسانے کہہ سکتے ہیں، بقول سعادت سعید

"یہ افسانے ایک منتشر فکری نظام کی بنیادیں متزلزل کرنے کا دباؤ لئے ہوئے ہیں۔"

حکایات کا حامد انسانی وجود کی معنویت کی تلاش میں اسی طرح سرگرداں ہے جس طرح خود مصنف۔

بدگمانیاں :

وقت کی کہانیاں اور گردش کے مختصر مجموعوں کو ازاں بعد انیس ناگی کے افسانوں کے کلیات "بدگمانیاں" میں جمع کر دیا ہے اس کی چھبیس کہانیوں میں سے پہلی دس کہانیاں حکایات سے تعلق

رکھتی ہیں اور دیگر دوسرے دو مجموعوں سے۔

ان افسانوں کے کردار زیادہ تر خوف اور اضطراب کا شکار ہیں، ان میں سے بیشتر کا تعلق دفتری زندگی سے ہے اور یہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور اقتصادی مسائل کا شکار ہیں، زیادہ تر افسانوں میں بیوروکریسی اور دفتری نظام پر گہری تنقید کی گئی ہے۔

''انکل ڈک کی موت'' کے موضوع پر شہری زندگی کی بے خبری کی عکاسی کی گئی ہے۔ یہ کہانی دور حاضر میں افراد کی نفسا نفسی کا بیان ہے، بے حسی، خود غرضی اور ناہموار باہمی تعلقات معاشرتی زوال کا باعث ہیں یہ لاتعلقی سرمایہ دارانہ نظام کی پیدا کردہ ہے۔

''بد باطن'' دو کرداروں کے مشاہدات کی کہانی ہے جن میں سے ایک کہانی لکھنے والا اور دوسرا ایک مزدور ہے، مصنف کہنا یہ چاہتا ہے کہ

''کہنے کو تو سارے انسان جسمانی طور پر ایک سے ہیں لیکن ان کے باطن ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔''

''گردش'' ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جس کی تاریخ پیدائش کا اندراج موجود نہیں، یہی غلطی اسے ملازمت کے آخری موقع سے محروم کر دیتی ہے، یہ عدمیت کے تصورات سے بھری کہانی ہے جہاں انسان کی موجودگی بے معنی اور اس کی تاریخ پیدائش کا اندراج زیادہ معنی دار ہے۔

''فیصلہ'' ایک یتیم شخص کی کہانی ہے جو ملازم ہے اور بے یقینی کا شکار ہے اسی کہانی میں ایک مسافر عورت کا بھی بیان ہے جو ایک شہر سے دوسرے شہر میں آئی ہے اور واپسی کا کرایہ نہیں رکھتی وہ سوچتی ہے

''میں واپس جانے کا کرایہ کہاں سے لاؤں، بھیک مانگوں یا بڑا کام کروں۔''

''بریک ڈاؤن'' جدید عہد میں انسانی زندگی میں مادی آسائش کے باوجود احساسِ محرومی کی کہانی ہے۔

''ایک کہانی'' آرام پسند دفتری نظام اور عدم سکون کا شکار رہنے والے اہلکاروں کی کہانی ہے، اس دفتر کے تمام اہل کار بے جا فراغت کے باعث طرح طرح کے عارضوں کا شکار ہیں۔

''مشکل آدمی'' میں ایک ملازم پیشہ شخص کے نفسیاتی عارضوں کو سمجھنے کے لئے دفتری نظام کے

معمولات کو موضوع بنایا گیا ہے۔

''ایک ناممکن کا سفر'' ایک سروے کرنے والوں کا قصہ ہے جو مطلوبہ شہر میں ٹریفک ہجوم کے باعث داخل نہیں ہو سکتے اور تیس دن تک شہر کے تین دروازوں کے چکر لگا لگا کر تھک جاتے ہیں۔

''وبی'' ایک شخص کے وائرس کے ذریعے سارے شہر کے کمپیوٹر سسٹم کو منجمد کرنے کی کوشش ہے جہاں یہی شخص وائرس کی ایجاد کے دوران وائرس میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

''سایہ اور زرد دھواں'' کا مرکزی کردار خود مصنف ہے، دونوں کہانیاں بے کار اور فارغ دفتری زندگی کی غماز ہیں۔

''عورت کہانی'' کی عورت افسردہ، تنہا اور اداس ہے وہ زندہ ہے لیکن زندگی کے ذائقے سے محروم رکھی گئی ہے۔

''ایک افسانے کی تیاری'' یہ ایک کہانی نما مضمون ہے، افسانوی سطح پر یہ عمل اپنے لسانی مزاج میں ایک خاص تجربہ ہے، ایک مقام پر مصنف نے لکھا ہے۔

''یہاں ایک فرق بیان کر دینا ضروری ہے کہ کہانی اور افسانے میں فرق ہوتا ہے افسانہ ایک ڈھانچہ ہوتا ہے جس میں کہانی کی لڑی چلتی ہے، میں اس کہانی کو سوچے سمجھے بغیر کسی منصوبہ بندی کے بغیر لکھتا جاؤں گا، دیکھیں یہ افسانہ بنتا ہے یا کہانی تک پہنچ کر دم توڑ دیتا ہے۔

کہانی کے اختتام پر کہانی کا ہیرو ڈاکٹر کہتا ہے۔

''میں ڈاکٹر ہوں قصائی نہیں اور گاؤں چھوڑ دیتا ہے۔''

اس طرح ٹکڑوں میں بٹی ہوئی یہ کہانی چھوٹی چھوٹی اخلاقیات سے گذرتے ہوئے اپنے انجام کو پہنچتی ہے، بقول مصنف

''میں نے کہانی کو افسانہ بنانے کی پوری کوشش کی ہے اور بہت پینترے بھی بدلے ہیں لیکن جب کہانی افسانہ بننے لگی تو سارے کے سارے پینترے دھرے کے دھرے رہ گئے اور کہانی مجھ سے پوچھے بغیر خود افسانہ بن گئی ہے۔''

اس کہانی کو ہم انیس ناگی کی زبان میں ''اینٹی افسانہ'' کہہ سکتے ہیں۔

تمثیل 3، کہانی کا آغاز اس طرح ہے

وہ میرا ہمشکل تو نہیں ہے

البتہ میرا ہم نام ہے

اس ہم نام کے منہ میں زبان نہیں اور اس کا چہرہ ہر تاثر سے مبراء ہے۔ کہانی بیان کرنے والے کو بھی چہرہ خاکی کاغذوں کی درزوں سے جھانکتا رہتا ہے۔ مصنف نے اسے دوسرے کی داخلیت میں سوراخ کرنے کی کوشش قرار دیا ہے، ایک دن عقدہ کھلتا ہے کہ ہم نام مر گیا ہے یہ موت ایک دھبہ کے پھیلنے سے ہوئی ہے۔

''ہم نام کی موت کے ساتھ ہی کہانی کار کو احساس ہوتا ہے کہ اس کے جسم پر بھی اسی سفید دھبے کی موجودگی ظاہر ہوئی ہے جس سے ہم نام کی موت واقع ہوئی، یہ دھبہ پھیلتا چلا جاتا ہے اور آخر کار کہانی کار کا وجود بھی دھبے میں تبدیل ہونے لگتا ہے''

موت کے خوف کی یہ تمثیل اس فقرے پر ختم ہوتی ہے۔

''میں نے اس کا خط اوندھا کر کے میز پر رکھ دیا ہے۔''

انیس ناگی نے اپنے افسانوں کے موضوعات اور تکنیک کے تنوع سے انہیں منفرد بنایا ہے ان کا اسلوب آسان، رواں اور لچکدار ہے، یہ افسانے جدید شعور کی بدولت ایسا سماجی منظر نامہ پیش کرتے ہیں جس میں انسان بے حیثیتی کے آخری مقام پر ہے۔ مصنف کا تصور سازی کا عمل بھی قابلِ توجہ ہے۔

افسانے :

''نئے افسانے کی کہانی'' 2008 میں جمالیات نے شائع کی، کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں افسانے سے متعلق کچھ مباحث ہیں اور دوسرے حصے میں سات افسانے شامل ہیں۔ جن میں سے ایک افسانے کی تیاری اور تمثیل 3 ان کے افسانوی کلیات ''بدگمانیاں'' میں بھی شامل ہے۔

باقی چار افسانے امین جگلو، سفرنامہ، چاندرات، پروین کی کہانی اور ایک لمبی دوڑ مصنف کی بنیادی فلاسفی یعنی انسانی بے اثباتیت کے گرد ہی گھومتے ہیں۔

امین جگلو ایک خود ساختہ ماہر جنسیات، اس کے ڈرائیور اور ڈرائیور کی بیوی کی جسمانی ضروریات کے گرد بنا گیا افسانہ ہے۔

سفرنامہ گاؤں کی ایک لڑکی کے گرد بُنا گیا افسانہ ہے جو بڈھے چوہدری کی چوتھی بیوی بننے کی بجائے گھر سے بھاگنے میں عافیت محسوس کرتی ہے کیونکہ اس کے گھر والوں کا خیال ہے۔

''عورت بھی زمین ہوتی ہے، ہم ایک زمین دے کر دوسری زمین واپس لے رہے ہیں۔'' (ص100)

''چاندرات'' شعور، تحت الشعور اور لاشعور کے تصادم کی کہانی ہے۔

''پروین کی کہانی'' ایک گھریلو ملازمہ کی نفسیات بیان کرتی ہے۔

''لمبی دوڑ'' میں میراتھن ریس کو موضوع بنایا گیا ہے، میراتھن ریس آخری لمحے احتجاج، آنسو گیس اور مظاہرین کے تشدد میں تبدیل ہوگئی ہے۔

''راشد نے بھی آنکھوں پر رومال رکھ کر اپنی دوڑ کو جاری رکھا ہے، اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا ہے، تمام ایتھلیٹ غائب ہوگئے ہیں اور وہ صرف وہی تنہا ہانپتا ہوا بھاگتا جا رہا ہے، بجلی کا پٹر پھر آسمان کی طرف چلے گئے ہیں، ارشد کو یقین ہوگیا ہے کہ اس نے یہ دوڑ جیت لی ہے، اس نے بمشکل تین چار قدم اٹھائے ہیں کہ اس کا سر چکرایا ہے اور وہ منہ کے بل جوگنگ ٹریک پر گر گیا ہے۔'' (ص138)

انیس ناگی کے افسانے مصنف کی منفرد سوچ اور منفرد تکنیک کا شاندار امتزاج ہیں، یہ افسانے ناولوں کی طرح مخصوص نفسیاتی تناظر میں لکھے گئے ہیں۔ ان کی بنیادی فضا میں انیس ناگی کے ناولوں اور شاعری سے مختلف ہیں۔

خود نوشت

ایک ادھوری سرگذشت :

اس کتاب کے تین ایڈیشن شائع ہوئے، آخری ایڈیشن 2008 میں جمالیات نے شائع کیا، جس میں مصنف کے البم کی کچھ تصاویر اور پہلی کتاب کے مقابلے میں تین ابواب کا اضافہ ہے۔

''بہت مدت کے بعد'' کے زیرِ عنوان مصنف نے اپنے غیر ملکی سفروں کا حال بیان کیا ہے۔

''ن۔م راشد سے چند ملاقاتیں'' کے عنوان کے تحت راشد سے ملاقات کے چند واقعات ہیں۔

''فیض احمد فیض سے چند ملاقاتیں'' کے زیرِ اہتمام انیس ناگی نے فیض صاحب کے بارے میں کچھ واقعات قلم بند کیے ہیں۔

یہ دونوں مضامین اپنے مواد کے اعتبار سے متنازعہ ہیں۔ مثلاً مصنف نے فیض صاحب کے بارے میں لکھا ہے۔

> ''کثیر مطالعے کے بعد جب ادب کے بارے میں میرے پرسپشین میں وسعت آئی تو وہ مجھے اوسط درجے کے شاعر دکھائی دینے لگے، وہ زمانہ فیض صاحب کا مقبولیت کا زمانہ تھا اگر کسی ادبی محفل میں یہ کہا جاتا کہ فیض کی شاعری میں رومانیت ہے تو جاں نثار گلے پڑ جاتے'' (ص253)

اسی طرح راشد کے بارے میں لکھا۔

> '' نئے شعراء نے نئی شاعری کی وضاحت میں جو مضامین لکھے، راشد صاحب ان سے بہت نالاں تھے، وہ نئے شعرا سے اپنی لابی نہیں بنانا چاہتے تھے، راشد کا تعلق

اردو ادب کی بیورو کریسی سے تھا۔" (ص 247)

ادھوری سرگذشت سے چیدہ چیدہ واقعات آغاز کتاب میں نقل کر دیئے گئے ہیں، اس لئے یہاں ان کی تکرار کی ضرورت محسوس نہیں کی جا رہی، تاہم اس کتاب کے بارے میں کئی طرح کے مباحث اٹھائے گئے جن کا تذکرہ مناسب رہے گا۔

اس سلسلے میں کئی سوال اٹھائے گئے۔

1۔ یہ کتاب ناول ہے یا آپ بیتی
2۔ اس کتاب میں کتنا جھوٹ اور مبالغہ شامل کیا گیا ہے
3۔ اس کتاب کی صداقت کی تصدیق کیسے ہو سکتی ہے
4۔ اس کتاب کے ذریعے مصنف اپنی شخصیت کی کمزوریوں کا جواز چاہتا ہے
5۔ اس کتاب کو مصنف کی باقی کہانیوں کا تسلسل سمجھا جا سکتا ہے

بقول قاضی جاوید،

"میں سمجھتا ہوں یہ انیس ناگی کی آٹو بائیوگرافی نہیں یہ پورے پاکستان کی بائیوگرافی ہے، اس کتاب میں انیس ناگی نے اپنے آپ کو حد سے زیادہ پہچان لیا ہے، انہوں نے یہ عمل اپنے نفسیاتی ارتقاء کے مطالعے سے مکمل کیا ہے ان کے تصور کی بنیاد مغائرے پر ہے ان کے بچپن اور بعد کی زندگی میں تنہائی اور مغائرے کی وجہ سے ان کا وجودیت کی طرف مائل ہونا ایک لازمی نتیجہ ہے اس کتاب کو اردو ادب میں انیس ناگی کا ایک بڑا کارنامہ کہوں گا۔" (نئے ادب کا معمار، ص 158)

بقول عبدالرشید

"مجھے اس کتاب کی تحریر کے دو مقاصد معلوم ہوتے ہیں وہ اپنے لئے ایک رشنل پیدا کر رہے ہیں، اپنی تنہائی اور علیحدگی کو Justify کر رہے ہیں خود اپنے لئے اور اپنے قاری کے لئے۔۔۔ انیس ناگی کے یہاں ایک Homelessness پائی جاتی ہے جو میٹا فزیکل ہے۔" (ص 159)

بقول مسعود اشعر

"یہ بے حد سلیس زبان میں لکھی گئی ہے اور بہت Readable ہے۔

بقول ڈاکٹر سلیم اختر

''انیس ناگی بچپن میں جس توجہ کا طالب تھا اس سے محروم رہا ہے، وہ اپنی تحریروں کی وجہ سے لوگوں کی نظر میں آیا ہے۔'' (ص165)

بقول یونس جاوید

''یہ ایک غیر معمولی کہانی ہے''۔ (ص166)

بقول انور سجاد

''اس میں انیس ناگی کی نثر بہت عمدہ ہے، اس میں ایک غیر معمولی روانی ہے''۔

بقول ڈاکٹر وحید قریشی

''یہ ایک بڑی کتاب ہے۔'' (ص168)

بقول زاہد مسعود

''یہ اردو ادب میں ایک غیر معمولی آٹو بائیو گرافی ہے جو سچ پر مبنی ہے۔'' (ص163)

بقول حسین مجروح

''انیس ناگی نے اپنے والد سے تضادات کے باوجود اپنی عملی زندگی میں بھی راست بازی کا مظاہرہ کیا جو ان کی والد کی شخصیت کا حصہ تھی۔'' (ص164)

بقول تبسم کاشمیری

''ادھوری سرگذشت نے اردو ادب کو یہ سلیقہ سکھایا کہ ادبی خود نوشت کیسے لکھی جاتی ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن اس اعتبار سے ادھورا تھا کہ اس میں داستان کا سفر خاموشی کے ساتھ رک گیا تھا اور اب برسوں بعد انیس ناگی نے اس ادھورے کی گم گشتہ منزلوں کی داستان بیان کی ہے۔''

یہاں ادھوری سرگذشت سے ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے جو مصنف نقطۂ نظر، خود اقداری نظام اور ادب سے اس کی لگن کا مکمل نمونہ ہے۔

''ادب کی تخلیق کے لئے اصرار کرنا ایک طرح کے پاگل پن سے کم نہیں ہے میرے کچھ ادیب دوست بھی اسی پاگل پن کا شکار رہے ہیں لیکن اب وہ میری طرح دست بردار ہوتے جا رہے ہیں

کہ ادب کی تخلیق اب ایک یک طرفہ ٹریفک ہے، ادیب کب تک دیوار کے سامنے تقریر کرتا رہے گا، اس احساسِ شکست کے باوجود میرے نزدیک لکھنا اور پڑھنا ایک عبادت ہے، یہ زندگی کی اعلیٰ ترین حقیقتوں اور صداقتوں کی تلاش ہے۔ میں اپنے آپ کو اس کی لذت سے محروم رکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے یہ اچھی طرح احساس ہے کہ میں ایک ناکام ادیب ہوں، مجھے یہ بھی اچھی طرح احساس ہے کہ میں نے ادب کے آدرش کے لئے اپنی ساری زندگی وقف کی ہے وہ بھی رائیگاں گئی ہے، عملی سطح پر بھی ایک ناکام اور بودا شخص ثابت ہوا ہوں جو ترقی اور عروج کی منازل طے نہ کر سکا۔ میں بین الاقوامی سطح پر ادب کا ستارہ بننا چاہتا تھا لیکن میں جغرافیائی اور تہذیبی سطح پر ایک ایسے خطے سے تعلق رکھتا ہوں جو ہمیشہ محکوم رہا ہے جو ہمیشہ انتشار میں رہا ہے اور دنیا کے نقشے پر کسی امتیاز کا حامل نہیں ہے، ایک ملک کا وجود ادیب کی شہرت میں برابر کا شریک ہوتا ہے۔" (ص 8)

"انیس ناگی نے بے شک اپنی تمام عمر ادب اور خاص طور پر پاکستانی ادب کے تشخص کے لئے بسر کی، یہ کام بھی کسی جہاد سے کم نہیں لیکن انہیں اس بات کا ہلکا سا افسوس رہا کہ ان تحریروں کی سنجیدگی پر زیادہ مصنف کو وہ تحسین حاصل نہیں ہو سکی جس کا وہ مستحق تھا۔ میری یہ تحریر روسو یا سینٹ آگسٹائن کے اعترافات نہیں ہیں بلکہ یہ تیسری دنیا کے سناریو میں لکھی گئی شکست کی ایک کہانی ہے کہ انسان نیک نیتی کے باوجود زندگی میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اچھی زندگی بسر کرنے کے لئے چاپلوس اور عیار ہونا ضروری ہے"۔ (ص 9)

یہ سرگذشت مجموعی طور پر مصنف کی زندگی کے چالیس پچاس برسوں کا احاطہ کرتی ہے، اس کی مجموعی فضا اداس اور مضطرب ہے۔ بہت سے مقامات پر مصنف نے اپنی تحلیل نفسی سے سرگذشت کو ایک کیس ہسٹری میں تبدیل کر دیا ہے۔ سرگذشت کا بیانیہ انداز اس کے ناولوں کے واحد متکلم کے بہت قریب ہے اس طرح سرگذشت ناولوں اور شاعری کے ساتھ ملا کر پڑھی جائے تو عمرانیاتی مطالعے کے لئے دروازے کھلتے ہیں، تاہم کئی مقامات میں مصنف کی تحریریں بھی اسی تضاد کا شکار ہیں جو ہمیں سرگذشت کے کئی صفحات پر نظر آتا ہے۔

ادھوری سرگذشت تاثراتی ادب کا بہترین نمونہ ہے۔

نثری اور شعری تراجم

نثری تراجم :

سیفس کی کھانی :

انیس ناگی نے فکشن جو تراجم کیے ان میں پہلی کتاب البیر کامیو کی سیفس کی کہانی ہے، یہ ایک فلسفیانہ کتاب ہے جو وجودیت اور لایعنیت کے تصور کو دلچسپی سے بیان کرتی چلی جاتی ہے یہ ترجمہ 1977 میں اشاعت پذیر ہوا، اس کا ایک ایڈیشن اردو سائنس بورڈ نے بھی شائع کیا۔ یہ ترجمہ براہ راست فرانسیسی سے کیا گیا ہے۔

طاؤن :

البیر کامیو کے ناول طاؤن کے ترجمہ بھی کم وبیش اسی زمانے میں کیا گیا، جو طاعون کی وباء کامیو کے جس شہر "اوراں" میں پھوٹی انیس ناگی کو کچھ عرصہ اس شہر میں رہنے کا موقع ملا۔ چنانچہ وجودی نظریات اور کامیو کی زندگی کے واقعات کے ساتھ ساتھ ترجمہ نگار فرانسیسی کلچر سے بھی آشنا ہوا، ترجمے کے لئے مصنف کے ساتھ ساتھ اس کے کلچر سے آگاہی ضروری ہوتی ہے۔ البیر کامیو نے ناول کے ترجمے میں دونوں خصوصیات موجود ہیں ۔ ازاں بعد اسی ناول کے تتبع میں مصنف کا اپنا ناول "چوہوں کی کہانی" شائع ہوا جسے پاکستانی اور ہندوستانی تہذیبی تنازعات کی روشنی میں لکھا گیا ہے۔

کایا کلپ :

یہ ترجمہ فرانز کافکا Franz kafka کے افسانے The Metamorphosis کا ہے جسے جمالیات نے شائع کیا۔

جواں مرگ کافکا بیسویں صدی کا وہ فکشن نگار ہے جس نے ہر زبان کے افسانوی ادب کو متاثر کیا ،اس کی شخصیت دوہرے پن کا شکار رہی ، وہ ادیب بننا چاہتا تھا اور اپنی ذات کی نمود و نمائش سے خائف تھا ،اس کی زندگی کو سب سے زیادہ اس کے باپ کے غیر معمولی رویے نے متاثر کیا ، چنانچہ وہ تمام عمر شعوری اور لاشعوری طور پر اپنے باپ کے خلاف لڑتا رہا ، کایا کلپ میں گریگور کی جون بدلنے کے بعد اس کے باپ کے رویے میں تبدیلی اور بیٹے سے نفرت کو شناخت کیا جاسکتا ہے۔

''کایا کلپ'' ایک پھیری والے تاجر کی کہانی ہے جو ایک صبح اٹھا تو وہ کیڑے میں تبدیل ہو چکا تھا ، کہانی کے شروع سے لے کر اس کا مرکزی کردار ''سامسا'' انسانی جون بدل جانے کے بعد بھی انسانی شعور برقرار رکھتا ہے۔

یہ طویل افسانہ کافکا نے جس سلیس انداز میں لکھا ہے ، ترجمہ میں بھی اس کا تتبع کیا گیا ہے۔

کافکا کی تحریریں انسانی مقدر کی بے بسی ، پژمردگی اور احساسِ زیاں کی کیفیات سے لبریز ہیں یہی مماثلت انیس ناگی کی فکشن میں دیکھی جاسکتی ہے۔

اس ترجمے کو سہ ماہی مجلّہ ''دانش ور'' کے شمارہ 11,12,13۔1992ء میں شائع کیا گیا۔

تہہ خانے سے :

فیدور دوستوئیفسکی کی کتاب 'Notes from underground' کا یہ ترجمہ جمالیات نے 2003 میں شائع کیا۔

ناول کے تعارف کے لئے ترجمہ نگار نے مصنف کی زندگی کے حالات اور ناول کی نظریاتی اساس پر روشنی ڈالی ہے بقول اس کے ''تہہ خانے سے'' دوستوئیفسکی کے اہم ترین نظریاتی ناول

میں سے ایک ہے۔ اس ناول کی دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ ناول اپنے داخلی سٹرکچر کے اعتبار سے غیر معمولی ہے، مواد کے اعتبار سے ناول کا پہلا حصہ انسانی شعور، داخلیت اور احساس کمتری کے بارے میں مصنف کے خیالات کا شعور، داخلیت اور احساس کمتری کے بارے میں مصنف کے خیالات کا آئینہ ہے، ناول کا دوسرا حصہ کہانی کے عنصر سے مزین کیا گیا ہے، یہ ناول 1864ء سے ایک روسی اخبار ''EPOCH'' میں شائع ہونا شروع ہوا، اس اخبار کا مدیر دوستوفسکی کا بھائی تھا، ناول کا دوسرا حصہ اس نے شدید مالی حالات اور بیوی کی علالت کے دوران لکھا۔ بظاہر یہ ناول ایک ایسے شخص کے اعترافات ہیں جو گذشتہ چالیس برس سے زیر زمین ہے، اس مقید زندگی میں وہ اپنی ذات، اپنے حلیئے بلکہ اپنی ہر چیز کی نفی کرتا ہے اور ارد گرد کی دنیا کا تمسخر اڑاتا ہے۔ ناول کا بیشتر حصہ خود کلامی پر مبنی ہے۔ ناول کا ہیرو ''لیزا'' نامی طوائف کی سچی محبت کے باعث نجات پاتا ہے۔

''تہہ خانے کا ہیرو، اس کی خود کلامی اور شعوری ولاشعوری کش مکش ہمیں انیس ناگی کے ناولوں میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ ترجمہ رواں، سادہ، پُر اثر اور سریع الفہم ہے۔

''میں ایک بیمار آدمی ہوں، میں ایک زہریلا آدمی ہوں، میں ایک روکھا آدمی ہوں، میرا خیال ہے میرا جگر خراب ہو چکا ہے، بہر کیف مجھے اپنی بیماری کے بارے میں کچھ نہیں معلوم، میں یقینی طور پر اپنی بیماری کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا، اس لئے میں ڈاکٹر سے مشورہ نہیں کرتا، اگر چہ میں علم طب اور ڈاکٹروں کی قدر کرتا ہوں، اس سے قطع نظر میں بہت وہمی ہوں، پھر بھی میں ڈاکٹروں کی عزت کرتا ہوں (میں بہت پڑھا لکھا ہوں اور مجھے ایسا نہیں ہونا چاہیے جو کہ میں ہوں)'' (ص 15)

ترجمہ اگر تخلیقی ہو کر ہے تو دوستوفسکی اور انیس ناگی دونوں کی تخلیقی حسیت بہت سی مماثلتیں رکھتی ہے۔

ہوائیں :

سنیٹ جان پرس کی شہرہ آفاق نظم The Wind کا یہ ترجمہ 1976ء میں شائع ہوا، اسے بھی

فرانسیسی سے اردو میں منتقل کیا گیا، پرس کو شاعروں کا شاعر کہا جاتا ہے۔ اس کی نظموں میں اساطیری اور جدید علوم کی بہت سی اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں۔ اس طویل نظم میں بنیادی طور پر "ہوا" کا استعارہ استعمال کیا گیا ہے۔ پھر اسے زمانوں کی سفیر قرار دیا گیا ہے۔ نظم کچھ مقامات پر مبہم ہے کیونکہ اس کا تلازمہ کئی مقامات پر تخیلاتی اپج کے باعث لسانی اسلوب سے میل نہیں کھاتا، اردو لغت بہت سی جگہوں پر پرس کے تجربات کا ساتھ نہیں دے سکی۔ تاہم نثری نظم کی ترقی و ترویج کے توسط سے یہ ترجمہ اپنی ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔

انیس ناگی نے سینٹ جان پرس کی دیگر نظموں کے تراجم بھی کئے ہیں اور اس انتخاب کا نام "جلا وطنی اور دوسری نظمیں" رکھا گیا ہے۔

"آہ زبان کا عظیم الشان درخت جو سروشِ غیبی اور مقولوں سے آباد ہے، اور جو علم کی پن چکیا میں پیدائشی نابینے کی بڑبڑاہٹ کو بڑبڑا رہا ہے"

بقول ڈاکٹر وحید قریشی

"انیس ناگی نے پرس کے احساسات کی ترجمانی کرتے ہوئے اپنا جدا انسانی پیکر وضع کیا ہے"۔

شعری تراجم :

جہنم میں ایک موسم(Arthur Rimbaud):

یہ آرتھر راں بو کی نظم(A SEASON IN HELL) کا ترجمہ ہے، اسے جمالیات نے 1981ء میں شائع کیا۔

راں بو کے تعارف میں اس کے حالات زندگی کا جائزہ لیتے ہوئے ترجمہ نگار نے لکھا ہے کہ فرانسیسی ادب میں اسے ایک حد تک دیومالائی حیثیت حاصل ہے، عجیب و غریب مخلوق، ناہنجار روزگار، باغی، عظیم شاعر جیسی صفات اس سے منسوب ہیں، اسے اولین "سریلسٹ شاعر" بھی کہا

جاتا ہے، راں بو کے نظریات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ساری انسانیت شاعر کی ذمہ داری ہے اس لئے اسے صاحب کشف ہونا چاہیے، راں بو کے ان خیالات سے یہ گماں گذرتا ہے کہ اس کی تنقیدی اصطلاحات مذہبی اور صوفیانہ طریق کار سے ماخوذ ہیں۔

''جہنم میں ایک موسم'' نیکی بدی کی آویزش، انسان، شیطان، خدا، عیسٰی اور کلیا کے ذکر سے مزین ہے، راں بو کا کشف ملکوتی ہونے کی بجائے انسانی ہے۔

یہ نظم آٹھ ابواب پر مشتمل ہے اور ایک نثری نظم ہے، جس میں رحم، معصومیت اور تشدد کے ملے جلے جذبات کا آہنگ موجود ہے، زندگی کی سفاکیت کے باوجود شاعر آخری باب میں کہتا ہے کہ ہمیں زندگی کو برا بھلا نہیں کہنا چاہیے، ہم عنقریب نئے شہروں میں داخل ہونگے یہ شہر انسانی نجات کے شہر ہیں اور انہی شہروں کا خواب شاعر کی آنکھیں دیکھتی ہیں۔

''جہنم میں موسم'' کم وبیش ایک خودنوشت کا درجہ رکھتی ہے، ہر تخلیقی تحریر ایک نہ ایک سطح پر خود نوشت ہوتی ہے کیونکہ فنکار دیکھے دکھائے تجربات کے ذریعے مؤثر تخلیق نہیں کرسکتا، راں بو الفاظ کے نئے درجے مرتب کرتا ہے کہیں کہیں وہ مصرعوں کو نامکمل چھوڑ کر اور کہیں ارتاش کے ذریعے اپنے تجربات کو ایک ولی کا وژن بنانے کی بھی کوشش کرتا ہے۔

انیس ناگی کے ترجمے میں سے ایک اقتباس۔

''میں نے حروف حرکت کے رنگ دریافت کئے A سیاہ E سفید I سرخ O نیلا U سبز ہے میں نے ہر حرف صحیح کی ہیئت اور حرکت کے اصول وضع کئے اور جبلی آہنگ کی بدولت میں نے فخر سے کہا کہ میں نے ایک ایسا شاعرانہ لفظ دریافت کیا ہے جو ایک یا کسی تمام حواس کی رسائی میں ہوگا، میں نے ترجمہ کے حقوق محفوظ رکھے''۔

(لفظ کی کیمیا گری ہذیان 2، ص 38)

یہ ایک جذباتی نظم ہے، ترجمہ نگار نے اس کے ترجمے کے دوران مصرعوں کے اتار چڑھاؤ اور تراکیب سے زیادہ اس کے بنیادی لہجے پر محنت کی ہے، یہ ترجمہ ازاں بعد

انیس ناگی کے رسالے دانش ور میں 1993 میں شائع ہوا۔ (ص 17)

انیس ناگی نے سینٹ جان پرس کی شاعری سے ''جلاوطنی اور دوسری نظموں کے بھی تراجم کیے، پرس کو عام طور پر اس کی مشکل پسندی کی وجہ سے شاعروں کا شاعر کہا جاتا ہے، اردو شاعری کے دامن کو مالا مال کرنے کے لئے دیگر زبانوں کے شعراء کے تراجم ایک مستحسن قدم ہے۔

ٹی ایس ایلیٹ کی نظمیں :

اس کتاب کو جمالیات نے 1997ء میں شائع کیا۔ اس کتاب میں ویرانہ، مردوں کی تدفین، شطرنج کی ایک بازی، آگ کی مناجات، پانی کے قریب موت، طوفان نے کیا کہا، کھوکھلے آدمی، الفرڈ پرو فورک کا نغمۂ محبت، دریچے پر صبح، ابتدائیہ، ابتدائیہ 3، ایک نظم اور پہلا بند، شامل ہیں۔

ایلیٹ کے بارے میں مترجم کی رائے ہے کہ گذشتہ نصف صدی میں اس نے بطور شاعر اور نقاد اپنے اثرات دور دور تک پہنچائے ہیں۔ وہ ایک مشکل شاعر ہے جس کے ہاں مذہبی اور دیو مالائی حوالے موجود ہیں اس لئے اس کی نظموں کا ترجمہ کچھ آسان کام نہیں تاہم اس ترجمے میں کوشش کی گئی ہے کہ شاعر کے متن سے انحراف نہ کیا جائے۔

ایلیٹ کی شہرت کا بڑا سبب اس کی طویل نظم خرابہ / ویرانہ (The Waste Land) بنی جو 1922ء میں شائع ہوئی۔ اس نظم کو اعتراضات واختلافات کے باوجود بڑی نظم کا درجہ حاصل ہے۔ انیس ناگی کے ترجمے کے علاوہ عزیز احمد اور رفیق خاور نے بھی ایلیٹ کی اس نظم کا ترجمہ کیا ہے، تاہم انیس ناگی کا ترجمہ رواں اور سلیس ہے۔

''میرا خیال ہے ہم چوہوں کے بل میں ہیں
ہم مردہ انسان ہیں جن کی ہڈیاں گم ہو چکی ہیں
یہ شور کیسا ہے
دروازے کے نیچے ہوا ہے

یہ شوراب کیسا ہے؟ ہوا کیا کر رہی ہے
کچھ نہیں، پھر بھی، کچھ نہیں
کیا تمہیں، کچھ خبر نہیں ہے؟(ص18.19)

پابلو نرودا کی نظمیں :

انیس ناگی نے لاطینی امریکہ (چلی) کے عظیم شاعر پابلو نرودا کی نظموں کے تراجم کئے، مترجم نے ہر مقام پر اصل متن کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ نرودا ایک پُر گو شاعر ہے جس کے چالیس کے قریب شعری مجموعے شائع ہوئے۔ اس کی زبان و بیان کے ساتھ ساتھ موضوعاتی شعریت بھی قابلِ توجہ ہے۔ نرودا نے اپنی بہت سی نظموں میں روز مرہ کی معمولی اشیاء کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ جیسے گھڑی، قمیض، ٹماٹر وغیرہ انیس ناگی نے نرودا کا تعارف کراتے ہوئے برملا یہ بات بتائی ہے کہ نرودا کی زبان محاورے اور کلچر تاریخ کی صورت حال سے بالکل مختلف ہیں۔ اس کے باوجود نرودا کی شاعری نے تاریخ سے جنم لیا ہے، اس نے اپنی شاعری کو خوابوں پر فاشزم کے خونخوار عفریت کو پنجے گاڑ کر لہو پیتے محسوس کیا ہے اور اسی لہو سے وہ اپنی قبا کو لالہ زار کرتا ہوا مزاحمت کا راستہ اپناتا ہے۔ یہ اس کے بس میں نہیں کہ مسطائیت سے غیر جانبدار رہ کر تاریخ کا تماشہ کرتا اسی لئے وہ چلی واپس گیا اور سپین کے محبِ وطن لوگوں کے لئے جد و جہد کی، اس کے ڈرامہ نگار شاعر دوست لورکا کو گولیوں سے اڑا دیا گیا۔ نرودا کا مزاحمتی رویہ ہمیں انیس ناگی کی تحریروں میں بھی دکھائی دیتا ہے۔

انیس ناگی نے اس کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے۔

"نرودا ایسے پُر گو شاعر کی نظموں کا انتخاب بے حد مشکل ہے۔ ہر نظم دوسری کو مات دیتی ہے، نرودا کے ہر شعری مجموعے کا موضوع اور لحن دوسرے شعری مجموعے سے مختلف ہے۔ نرودا کے مترجمین کا خیال ہے کہ اس ریڈیکل شاعر کے مکمل ترجمہ

کے لئے مترجمین کے گروہ درکار ہیں۔۔۔ترجمہ کے عمل میں ان نظموں کو زیادہ مر
صع کیا جا سکتا تھا لیکن میں نے اصل متن کی بارآفرینی کی بجائے اس سے قریب
رہنے کی کوشش کی ہے"۔

یہاں نرودا کی ایک نظم "شاعری" کے ترجمے کا کچھ حصہ نقل کیا جاتا ہے۔

"اور یہ عمر کی وہ منزل تھی۔۔۔جب شاعری
میری تلاش میں نکلی تھی، میں نہیں جانتا، نہیں جانتا ہوں۔
یہ کہاں سے آئی تھی، سردی کے موسم یا دریا کے کنارے سے مجھے علم نہیں ہے، کہاں اور کب
نہیں وہ آوازیں نہیں تھیں، وہ الفاظ بھی نہیں تھے۔
لیکن ایک گلی سے کسی نے مجھے پکارا تھا
رات کی شاخوں میں سے
ایک دن دوسروں کے درمیان میں سے
تجزی آگ سے
اور تنہا لوٹتے ہوئے
میں چہرے سے محروم ہو چکا تھا
اس نے مجھے چھو لیا تھا۔"

"Poems of Iqbal"

اقبال کی نظموں اور ایک غزل کا یہ انگریزی ترجمہ جمالیات نے شائع کیا، جس کی گلوسری ر
تدوین جیلانی کامران نے لکھی، نظموں میں مسجد قرطبہ، لینن، ساقی نامہ، ایک شام، زندگی، انسان

، ایک نظم اور فلسفہ و مذہب شامل ہیں۔

ترجمہ نگار نے دیباچے میں لکھا ہے اگرچہ اقبال جیسے عظیم شاعر کے بارے میں اردو میں بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن شاید ہی اس کی نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کیا گیا ہو، اس بے اعتنائی کی بڑی وجہ اقبال کی اسلام دوستی ہے جسے مغرب کی آنکھ نے شک کی نظر سے دیکھا ہے۔ اس لئے ان تراجم کو ایک عظیم شاعر کے لئے نذرانہ عقیدت سمجھا جائے۔

انیس ناگی جدید شاعری میں اگرچہ غزل کو کوئی خاص اہمیت دینے کے حق میں نہیں تاہم انہوں نے اقبال کی غزل کو ترجمہ کے لئے منتخب کیا ہے۔

Are you or am I the manifest sceret of the world of elements?

Are you or am I the world of that bidden from the eyes?

And the night of anguish and Consmmation which is called life?

Are you or am I the dawn, are you or am I its call to prayer?

For whose appearane day and night are in motion?

Are you or am I the burden on the shoulder of time?

You are a foot print on the dust with vision

Are you or am i the water which is life of the existence?

اقبال کی غزل کچھ اس طرح ہے

عالم آب و خاک و باد، سرِ عیاں ہے تو کہ میں

وہ جو نظر سے ہے نہاں، اس کا جہاں ہے تو کہ میں

وہ شب درد و سوز و غم، کہتے ہیں زندگی جسے

اس کی سحر ہے تو کہ میں، اس کی اذاں ہے تو کہ میں

کس کی نمود کے لئے شام و سحر ہیں گرم سیر
شانۂ روزگار پر بارِ گراں ہے تو کہ میں
تو کفِ خاک و بے بصیر، میں کفِ خاک و خودنگر
کشتِ وجود کے لئے آبِ رواں ہے تو کہ میں

Modern Urdu Poems from Pakistan

1976 میں ص ن پبلی کیشنز نے یہ انتخاب لاہور سے شائع کیا۔ جدید شعراء میں فیض احمد فیض، ن۔م راشد، مجید امجد، منیر نیازی، جیلانی کامران، محمد صفدر میر، ظہیر کاشمیری، عبدالرشید، سلیم الرحمٰن، سرمد صہبائی، ریاض مجید، کشور ناہید، سعادت سعید، فہیم جوزی، زاہد ڈار، عباس اطہر اور چند دیگر شعرا کی نظموں کے تراجم شامل ہیں۔
ایک لحاظ سے یہ انگریزی تراجم پاکستانی شعراء کو مغربی دنیا میں متعارف کرانے کی اولین کوشش ہے۔

تنقید و تحقیق

تنقیدِ شعر :

یہ کتاب پہلی مرتبہ 1966 میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کو ایم۔اے اردو کے تنقیدی پرچے کی امدادی کتاب کی حیثیت سے لکھا گیا تھا، مصنف نے کتاب کے دوسرے ایڈیشن، شائع کردہ مکتبہ میری لائبریری لاہور 1968 کے پیش لفظ میں لکھا۔

"شاعری سے لطف اندوز ہونے کے لئے جذباتی تربیت ایک اہم شرط ہے۔ شاعری کی تحسین میں "آہ" اور "واہ" کا تنقیدی اسلوب فرسودہ ہو چکا ہے۔ تخیلاتی ادب اور بالخصوص شاعری سے لطف اندوز ہونے اور اس کی معنویت کو سمجھنے کے لئے تجزیاتی طریقِ فکر کی ضرورت ہے، شاعری کے اجزائے ترکیبی اور تخلیقی عمل کو سمجھنے کی خواہش نے مجھے "تنقیدِ شعر" کی تخلیق پر مجبور کیا۔"

کتاب میں شاعری کے مختلف نظریات، شاعرانہ خیال، شاعرانہ تجربے، شاعرانہ ہیئت، لفظ، شعر، تخیلہ، شاعرانہ آہنگ، استعارہ، امیجری، علامت اور تنقیدِ شعر کے موضوعات بیان کئے گئے ہیں۔ مبادیاتِ شعر کے اس مطالعے سے متعلق ڈاکٹر سید عبداللہ کی رائے ہے۔

"یہ مضامین بظاہر تدریسی ضرورتوں کے تحت لکھے گئے معلوم ہوتے ہیں مگر ان میں شعر و شاعری کی دریافت، ساخت اور دریافت کے سلسلے میں معلومات اس طرح پیش کی گئی ہیں کہ قارئین بھی ان کو مفید پائیں گے۔ انیس ناگی کا قلم ان مضامین میں محتاط ہو کر چلا ہے تا کہ قارئین قطعی تصورات کو اخذ کر لیں۔ اعتدال و

احتیاط کی اس خوبی کے باعث مجموعے کی افادیت یقینی ہوگئی ہے۔"

اس کتاب کا انتساب "عفت انیس" کے نام ہے۔ یہ کتاب آج بھی اپنی افادیت کے حساب سے ادب کے اساتذہ اور طلباء کے لئے کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ شاعری کے مختلف نظریات کے باب میں ارسطو کے استاد افلاطون سے لے کر فرائیڈ ے کی تحلیل نفسی تک نہایت آسان زبان میں ایک محاکمہ موجود ہے آخری مضمون تنقید شعر میں مصنف نے لکھا ہے۔

"شاعری کی فنی تنقید شعری واردات کو مخصوص انداز سے پرکھنے کا ایک انداز ہے، بعض حالتوں میں یہ تمام قیود کو قبول کرتے ہوئے بھی اس سے باہر نکل جاتی ہے، شاعری کی تنقید کے مختلف منصب ہیں، کبھی یہ شعری تصورات سے بحث کرتی ہے۔ کبھی فنی محاسن و معائب کا جائزہ لیتی ہے اور کبھی شعری ذوق کی اصلاح کی ذمہ داری قبول کرتی ہے، ان تمام مراحل کی غرض و غایت شاعری کا افہام ہوتا ہے اور اس کو ایک تخلیقی فعلیت کے طور پر مان کر اس کی انسانی زندگی میں قدر و قیمت کو متعین کرنا ہوتا ہے۔

ازاں بعد انیس ناگی نے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے کے لئے بھی شعری لسانیات (استعارہ، علم المعانی اور شاعری کا تعلق) کے موضوع کا ہی انتخاب کیا، انہوں نے 995ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

ڈپٹی نذیر احمد کی ناول نگاری:

یہ کتاب فیروز سنز لاہور نے شائع کی، اس کا پہلا ایڈیشن 1967 میں شائع ہوا، یہ کتاب بھی درسی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے لکھی گئی۔ کتاب کے ابواب کی فہرست کچھ اس طرح ہے۔

9۔ نذیر احمد کی مذہبی اور اخلاقی قدریں 10۔ نذیر احمد کا فن

کتاب کا پہلا مضمون نذیر احمد کی گمراہ شخصیتیں اور ساتواں مضمون نذیر احمد کی نسائی قدریں انتہائی دلچسپ ہیں، بقول مصنف

''نصوح، حجۃ الاسلام، میر متقی اور ان سے ملتے جلتے کردار نذیر احمد کی شخصیت کے بدلے ہوئے روپ ہیں اور ان کی تشکیل میں وہ فنی معروضیت کو قائم نہیں رکھ سکے، یہ کردار اپنی تمام تر منطقیت اور عقلیت کے باوجود جذباتی ہیں اور ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں''۔(ص21)

''دراصل نذیر احمد کی نسائی قدریں مذہبی سالمیت کے تحفظ کا بدلا ہوا روپ ہیں ان کے پیش کردہ نظام معاشرت میں نسائی قدریں فعال ہونے سے زیادہ دفاعی ہیں۔ گھر سے باہر انہیں مذہبی قدروں کا زوال نظر آتا ہے اور افراد کو اس زوال سے بچانے کے لئے وہ خانگی اسلوب زیست کو مستحکم کرنا چاہتے ہیں۔''(ص95)

اس کتاب کے اب تک کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

نیا شعری افق :

یہ کتاب جمالیات نے 1969 میں شائع کی۔ اس کتاب کی غرض وغایت میں تدریسی اور نئے ادب خاص طور پر نئی شاعری کی تفہیم تھی۔ کتاب میں

1۔ نئی شاعری کا منصوبہ 2۔ نئی شاعری میں امیج

3۔ نئی شاعری کا لسانی لہجہ

جیسے مضامین کے ساتھ ساتھ ہم عصر شاعروں صفدر میر، افتخار جالب، عباس اطہر، سلیم الرحمٰن اور زاہد ڈار کی کتابوں پر تبصرے کیے گئے تھے۔ بقول انیس ناگی

''نئی شاعری کی دریافت اور ابہام کے لئے متناقص رویوں کی گونا گونی کی بنیاد ایک غلط ذہنی مفروضہ ہے کہ نئی شاعری کے نقاد اپنے ذہنی رویے کو بدلنے کی بجائے اسے

مروجہ شعری معیاروں اور جانچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔۔نئی شاعری کا نظریاتی اور
فنی لب ولہجہ ایک غیر جانبدارانہ توضیح چاہتا ہے لیکن یہ تب ہی ممکن ہے اگر نئی شاعری
کی معنویت کو حال کے ذہنی محل میں سمجھنے کی کوشش کی جائے۔"
کتاب میں صفدر میر کی شاعری کا مضمون ترقی پسند ادب اور میر صاحب کی شخصیت کا خوب
احاطہ کرتا ہے۔

شعری لسانیات :

انیس ناگی کی یہ کتاب 1969 میں شائع ہوئی یہ علم المعانی کے اعتبار سے اردو میں اپنے
موضوع کی پہلی کتاب ہے۔شعری لسانیات میں تین اجزا نہایت واضح دکھائی دیتے ہیں ایک تو
مغربی ناقدین کی آرا کا باقاعدہ سلسلہ ہے، دوسرے اردو شعری تاریخ سے حوالہ جات ہیں جو
ساری کتاب میں تنقیدی نقطۂ نظر کی وضاحت کے لئے استعمال کئے گئے ہیں تیسری خوبی جو معنی خیز
اور طبع زاد ہے وہ انیس ناگی کی عملی تنقید ہے انیس ناگی نے اپنی اس کتاب میں لکھا ہے۔
"زندگی شاعر کے لئے ایک لسانی حقیقت ہے جس کے معاملات اور واقعات
اس کے لسانی پیرایوں میں رونما ہوتے ہیں، الفاظ کی حرکت حیات انسانی کے لئے
اتنی ہی ناگزیر ہے جتنا نفس۔۔۔زندگی کو الفاظ اور الفاظ کو زندگی میں منتقل کرنے کا
عمل انسانی معاشرے کی طرح انسانوں کی ایک حیاتیاتی ضرورت ہے اور اس کا
مطالعہ اس کتاب کا جواز ہے۔" شعری لسانیات علم خطابت یا علم معانی و بیان کی
کتاب نہیں بلکہ تخفیم و تربیت کا ایک مظہر ہے"۔
استعارے کے ضمن میں مصنف نے جذبے کی بازیافت کا تذکرہ کرتے ہوئے شعری
استعارے کو ایک جہانِ معنی قرار دیا ہے۔اسی طرح شاعری میں ابلاغ، ابہام اور صرفی ونحوی
سیاق وسباق پر سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے۔
ازاں بعد 1990 میں اسی موضوع پر شاعر نے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

تصورات :

یہ کتاب پہلی مرتبہ 1976 میں شائع ہوئی ۔ ازاں بعد اس کتاب کو جمالیات نے 1996 میں شائع کیا۔کتاب کے مضامین کی فہرست کچھ اس طرح ہے۔

1۔	نثری نظم یا شاعری	2۔	نثری نظم اور بے ہیئتی
3۔	نئی تنقید کی خواہش	4۔	ادب اور جمود
5۔	دانشور کون	6۔	نیا افسانہ ایک دعوت نامہ
7۔	ترجمے کی ضرورت	8۔	شاعر اور آوارہ گردی
9۔	مجید امجد، شب رفتہ	10۔	اقبال انحراف کا شاعر
11۔	اقبال سے میری ملاقات	12۔	اقبال اور سلیم احمد
13۔	انور سجاد	14۔	بوڑھے شاعر کا المیہ
15۔	اریکا جونگ کی نظمیں	16۔	نیا افریقی لحن
17۔	بوڑھا مصور، پیکاسو	18۔	ایذرا پاؤنڈ کی موت پر
19۔	پابلو نرودا کی تلاش	20۔	رطب ویابس کا شاعر

اس مجموعے میں اقبال سے متعلق تین مضامین خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ بقول انیس ناگی

''ہر شاعرِ کبیر'' ہر عہد میں اپنے کلام کی نئی شرح حاصل کرتا ہے لیکن یہ اس وقت ہی ممکن ہے کہ ہم شعرِ اقبال کے مطالعہ میں ایک معروضیت پیدا کریں، جذباتی زارنگی کی بجائے اقبال کے فکری اور شعری نظام کو معروضی استدلال پر قائم کریں۔'' (ص 92-91)

''مضمون اقبال سے میری ملاقات'' کے سلسلے میں تنقید نگار لکھتا ہے

''میں کلام اقبال کا مطالعہ کسی ماقبل وجود مفروضے کے بغیر کرنا چاہتا ہوں تا کہ میری اور ان کی ملاقات کسی سفیر کے بغیر اور ان کے کلام کی صحت اور اس کی گونج براہ راست مجھ تک پہنچ سکے''۔ (ص 96)

اقبال پہلے باشعور شاعر تھے جن کا تخلیقِ ادب کا تصور براہِ راست زندگی کے جدلیاتی عمل سے پیدا کرتا ہے۔۔۔ان کے اردو کلام میں بھی ان کی تصوراتی کایت موجود ہے۔(ص113)

مذاکرات :

یہ کتاب بھی متعدد بار شائع ہوئی، اس وقت 1986 کا اشاعتی نسخہ جسے سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور نے دوسری بار شائع کیا پیشِ نظر ہے۔ کتاب کے مضامین کی فہرست اس طرح ہے

1۔	ادب میں اجنبیت	2۔	ادب اور تعلقات عامہ
3۔	بابو گوپی ناتھ سے ملاقات	4۔	سارتر کے لئے
5۔	غالب (۱)	6۔	انور سجاد کے نام ایک غیر شخصی مراسلہ
7۔	نیا افسانہ اور معنی آفرینی	8۔	افسانہ: اینٹی افسانہ
9۔	ترجمے کی نئی لہر	10۔	محمد حسن عسکری: تعزیت نامہ
11۔	ایک شخصی مکالمہ	12۔	نئے شاعر کے نام

کتاب میں انتظار حسین کے افسانوں کے مجموعے'' کچھوے'' اور خالدہ حسین کے افسانوی مجموعے ''پہچان'' کا خصوصی مطالعہ بھی شامل ہے۔

ادب میں اجنبیت، سارتر کے لئے، ادب اور تعلقات عامہ تنقید نگار کے وجودی خیالات کی پیش رفت ہیں، افسانے موضوعات پر، جو کچھ لکھا گیا ہے اسے آگے چل کر ایک۔اور کتاب'' نئے افسانے کی کہانی'' کا موضوع بنا دیا گیا ہے۔

انتظار حسین کے مجموعے کچھوے 1981 کے سولہ افسانوں پر سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے، بقول ناگی

''نظریاتی صنف اور تجربے کی تکرار کے باوجود انتظار حسین ایک اعلیٰ درجے کا صناع ہیں، وہ کہانی بنانا جانتے ہیں، اچھے موڈ میں ہوں تو افسانے کو کثیر المعانی

بنانے کے فن سے بھی آشنا ہیں، اعلیٰ تخلیقی لمحات میں وہ بے حد خوبصورت نثر بھی لکھتے ہیں لیکن نہ جانے ان کے شعور کو معاصر زندگی کی آب و ہوا کیوں راس نہیں آتی؟'' (ص 119)

اسی طرح خالدہ حسین کی افسانہ نگاری کے بارے میں لکھا گیا ہے۔

'' خالدہ حسین کے نسوانی کرداروں کی گھٹن مابعد الطبیعاتی ہے، ان کے یہاں بار بار متلی کی کیفیات کا اظہار ہے، وہ بوریت کا شکار ہیں، یہ کیفیات ان کے شعور کی مختلف حالتیں ہیں۔ مجموعی اعتبار سے ''پہچان'' کے افسانوں کی فضا پر کافکا کی گہری چھاپ ہے۔ (ص 126)

غالب ...... ایک شاعر ایک اداکار :

یہ کتاب پہلی بار سنگ میل نے اور دوسری مرتبہ فیروز سنز لاہور نے 1990 میں شائع کی۔

فہرست مضامین کچھ اس طرح ہے۔

اس کتاب کا دیباچہ ''مطلع'' کے نام سے سعادت سعید کا لکھا ہوا ہے۔ بقول سعادت سعید

'' یہ کتاب غالب کی شخصیت اور فن کے بارے میں نزاعی مباحث کا ایک ہنگامہ پرور سلسلہ بھی رکھتی ہے۔''

اس کتاب کے بیک کور پر لکھا ہے۔

غالب، ایک شاعر ایک اداکار، اردو تحقیق و تنقید میں پہلا تخلیقی کارنامہ ہے۔ ابھی تک غالب

پر جوکام ہوا ہے اس کا انحصار حالی کی یادگار غالب پر ہے، انیس ناگی نے بڑی جرأت سے غالب کی تحلیل نفسی کے ذریعے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ غالب کی شخصیت ایک عظیم فنکار اور ایک معمولی انسان کا مجموعہ تھی۔ غالب وہ نہیں تھے جس کا اظہار کرتے تھے یہ کتاب غالب پر پہلی طبع زاد کتاب ہے جس پر ایک مدت تک بحث وتمحیص کا سلسلہ جاری رہے گا۔

تیسرے مضمون میں سلیم احمد کی کتاب "اقبال۔۔۔ایک شاعر کا جائزہ لیا گیا ہے بقول ناگی

"ان مضامین میں ایک واضح سقم استدلال کی کمی ہے، سلیم احمد نے اس صنف کو گریز اور غیر ضروری تفاصیل سے مخفی کرنے کی کوشش کی ہے۔(ص 123)

فیض کے بارے میں مضمون "بوڑھے شاعر کا المیہ" پر بہت لے دے ہوئی جس میں مصنف نے ان کی کتاب "شامِ شہر یاراں" کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور شہرت کو شاعر کا المیہ قرار دیا ہے اور سوالات اٹھائے ہیں کہ اس کتاب میں انہی شعری تجربوں کو دہرایا گیا ہے جو فیض کی اس سے قبل شاعری کی کتابوں میں موجود تھے۔ بقول ناگی

"ان کی نظموں سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے یہاں مطالعے کی کمی ہے، نئے تجربات کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے، شہرت کی مزید خواہش اور فنی انحطاط وہ المیہ ہے جس سے شاعر دوچار ہے"۔

ایسی شاعری کو باقیات کے طور پر شائع کرنا مناسب ہو سکتا ہے ایک مضمون ظفر اقبال کے مجموعے "رطب و یابس" پر ہے، جس میں کہا گیا ہے۔

"نئی غزل کے لئے مابعد الطبیعاتی نظام سے انحراف کی ضرورت ہے، ظفر اقبال نے ان ضرورتوں کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے اس لحاظ سے یہ کتاب نئی غزل کا دستور العمل ہے۔"(ص 254)

نثری نظم یا شاعری، نثری نظم اور بے ہیتی، اریکا جونگ کی نظمیں ایذرا پا: نثر کی موت پر، پابلو نرودا کی تلاش انیس ناگی کے کثیر مطالعے کا اچھا نمونہ ہیں۔

مشاهدات :

اس کتاب کو" جمالیات" لاہور نے 1993 میں شائع کیا ہے۔ کتاب ادب کے جدید مسائل و مباحث کا احاطہ کرتی ہے۔ مضامین کی فہرست کچھ اس طرح ہے۔

1۔ ساختیات کی مخالفت میں
2۔ اردو میں تلفظ کا مسئلہ
3۔ معنی اور علم المعانی
4۔ وجودی نفسیات اور ادب
5۔ کچھ تجرید کے بارے میں
6۔ حقیقت نگاری اور نئی حقیقت نگاری
7۔ سارتر اور مزاحمتی ادب
8۔ اجنبی اور لایعنیت
9۔ نیا تھیٹر نیا ڈرامہ
10۔ ادبی انعام
11۔ داغ
12۔ راشد کی آخری کتاب "گماں کا ممکن"
13۔ آزاد نظم سے نثری نظم تک
14۔ پاکستانی مصوری
15۔ امراؤ جان ادا
16۔ فرانز کافکا
17۔ کامیو، دوراں اور طاعون
18۔ ادھورا ادیب
19۔ سینٹ جان پرس
20۔ اوکتاویو پاز

کتاب کے زیادہ مضامین ساختیات کی تحریک کی تنقید اور وجودی خیالات کی تائید سے متعلق ہیں، خاص طور پر سارتر، کامیو، کافکا اور سینٹ جان پرس کے خیالات سے انیس ناگی بہت حد تک اتفاق کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ مفاہمتی ادب اور مزاحمتی ادب جیسی اصطلاحات کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ کامیو اور سارتر کی توصیف میں انہوں نے لکھا ہے۔

"کافکا کا "سپر ریلزم" کامیو اور سارتر کے ناولوں میں دروں بینی نئی حقیقت نگاری کی مثالیں ہیں، ان تمام نے مظہریت اور اشیا کے اونتالوجیکل ادراک کو ترجیح دی جس کے نتیجے کے طور پر حقیقت نگاری یک سطحی ہونے کی بجائے مظہر کی متنوع جہتوں کو نمایاں کرتی ہے۔ سینٹ جان

پرس کی غیر معمولی انفرادیت اور عظمت کا انحصار وہ اس کے لسانی پیرائے پر رکھتے ہیں، اسی طرح اوکتاویو پاز کی شاعرانہ تخلیق اور لسانی استعمال انیس ناگی کے نزدیک قابلِ تعریف خوبی ہے۔ بقول ان کے

''اوکتاویو پاز کسی نظریے کا شاعر نہیں ہے، اس کی نظموں کی جذباتی حالت جدید شعور کی مظہر ہے، اس کی اکثر نظموں میں بے خوابی، بڑے شہروں کا شوروغوغا، آوازوں کی بھول بھلیاں، اصوات کے ذریعے زندگی کے مظاہر کی شناخت اور جدید ذہن کی داخلیت کے خلفشار کی مظہر ہے، بعض نقادوں نے اس کی شاعری کے ڈانڈے تصوف سے بھی جا ملائے ہیں۔ اس نے ہم عصر انسانی صورت حال کے بارے میں خاموشی کا رویہ اختیار کیا ہے۔''

غالب پریشاں :

یہ کتاب جمالیات نے 1993 میں شائع کی۔ اس کا سرورق حنیف رامے کی ایک تصویر سے مستعار ہے۔ اس کے مضامین کی فہرست یہ ہے۔

1۔	غالب کا دفاع	2۔	امراؤ بیگم کی مشکلات
3۔	غالب ہاتھ میں خوشبو 1857	4۔	غالب اور محکمہ تعلیم
5۔	غالب کی پنشن	6۔	نسخہ حمیدیہ
7۔	اداسی کا شاعر	8۔	غالب اور نسخہ امروہہ
9۔	غالب کے دشمن	10۔	غالب کی قمار بازی

اس کتاب کے مضامین مختلف حوالہ جات رکھتے ہیں، انگریز حکام کی دی گئی درخواستیں اور ان کے جوابات قاری کے لئے دلچسپی کا باعث ہیں۔

''اداسی کا شاعر'' مضمون میں مصنف نے غالب کا ایک شعر بطور حوالہ استعمال کیا ہے۔

ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسم ثواب سے
ٹیڑھا لگا ہے خطِ قلم سر نوشت کو

قسمت کی اسی مہربانی کو ازاں بعد انیس ناگی کی اپنی سرگذشت میں دیکھا جا سکتا ہے۔

نسخۂ امروہہ اور غالب کے دشمنوں پر دو مضامین بھی تحقیق کی اچھی مثال ہیں۔ بقول مصنف

''غالب کی زندگی عجیب و غریب تضادات کا اجتماع تھی، کچھ تضاد اور کچھ ابہام انہوں نے بعض مقاصد اور ضرورتوں کے تحت پیدا کئے تھے اور کچھ اس عہد کی صورت حال کے دباؤ سے ان کی شخصیت میں اس طرح سرایت کر گئے تھے کہ خود انہیں معلوم نہیں تھا، غالب عملی سطح پر کمزور شخصیت کے مالک تھے وہ بہت جلدی ترغیب کے نرغے میں آجاتے۔(ص146)

غالب کا مقدمہ پنشن:

یہ کتاب القمر انٹر پرائزز نے 1996 میں لاہور سے شائع کی۔ اس کتاب میں شامل مضمون کچھ اس طرح ہیں۔

1۔ غالب کی پنشن کا تنازعہ 2۔ غالب کی پنشن کی درخواستیں (اردو)

3۔ غالب کی پنشن کی درخواستیں (فارسی) 4۔ تین فریقوں کی کہانی

5۔ انگریزی درخواستوں کا متن

اس کتاب کے پیش لفظ میں محمد سعید اللہ صدیقی نے لکھا ہے۔

''غالب کے مقدمۂ پنشن'' غالب سے دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لئے ایک نادر تحفہ ہے۔ غالب کی وفات کو ایک سو چالیس برس کے قریب کا عرصہ ہو چکا ہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان کی ذات میں دلچسپی کا عنصر بڑھتا جا رہا ہے۔ غالب کی پنشن سے متعلقہ وہ دستاویزات شائع کی جا رہی ہیں جو پہلے منظر عام پر نہیں آئی

تھیں، ان نایاب دستاویزات کی اشاعت ہم غالب کے دوصد سالہ جشنِ ولادت
کے موقع پر کررہے ہیں۔"

انگریزی متن والی ان درخواستوں کا مطالعہ غالب کے شائقین کے لئے کئی نئے باب کھول سکتا ہے۔ آغاز کی درخواستیں عزت مآب ولیم بلنٹ اسکوائر کے نام لکھی گئی ہیں۔ جو 1835 اس زمانے میں آگرہ کے گورنر تھے جو دوسرے ناموں میں سی۔ٹی میٹکاف، جارج لارڈ آک لینڈ، ہی کمبن اور الیگزنڈر راس شامل ہیں۔

میری ادبی بیاض :

یہ کتاب جمالیات لاہور نے 1996 میں شائع کی۔ اس کے تین مضامین جو ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں ازاں بعد مصنف کی سوانح ادھوری سرگذشت لکھنے کے باعث بنے، ان مضامین میں جھلاہٹ، ایک بھولی ہوئی سرگذشت اور میری ادبی سرگذشت شامل ہے، بقول ناگی

> ''ادب کے سراب میں رہا ہوں، اب میری نگاہیں چندھیا گئی ہیں، میں ایک بات بتاتا جاؤں کہ زندگی کا بیشتر حصہ میں نے خراب صحت کے ساتھ بسر کیا ہے، لیکن میں نے ہمیشہ ظاہر یہ کیا ہے کہ میں بہت صحت مند ہوں، بیمار صحت کے ساتھ جو خوف اور نفسیاتی عارضے پیدا ہوتے ہیں، وہ سب کے سب میرے اندر موجود ہیں، میرے مخالف اور میرے اہلِ خانہ مجھے نیوراتی کہتے ہیں، میں ان میں سے کسی سے الجھنا نہیں چاہتا۔'' (ص 150)

معاصر ادب :

یہ کتاب جمالیات نے 1997 میں شائع کی۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ اس میں ہم عصر لکھنے والوں کی کتابوں پر تنقیدی تبصرے جمع کئے گئے ہیں۔ فہرست کچھ اس طرح ہے۔

1۔ چاندنی بیگم از قرۃ العین حیدر 2۔ آگے سمندر ہے از انتظار حسین

3۔ نادار لوگ از عبداللہ حسین — 4۔ راکھ از مستنصر حسین تارڑ
5۔ الکھ نگری از ممتاز مفتی — 6۔ خالی پنجرہ از انتظار حسین
7۔ دور سے از خشایاد — 8۔ جہنم میں از مسیح آہوجا
9۔ خواب اور پتنگ — 10۔ شہر یتی از آصف فرخی

فکشن کے اس مطالعے کے بعد دوسرے حصے میں ن۔ م راشد، مجید امجد، ناصر کاظمی، ظہور نظر، ضیا جالندھری کے کلیات کے ساتھ ساتھ منیر نیازی کی کتاب سفید دن کی ہوا اور ماہ شب کا سمندر اور جیلانی کامران کی طویل نظم "باغ دنیا" کا جائزہ لیا گیا ہے۔

متفرق تفصیل میں، ظفر اقبال کی ہے نیو مان اور عیب و ہنر، اختر احسن کی گم، گھر میں لنکا، زاہد ڈار کی محبت اور مایوسی کی نظمیں، تبسم کاشمیری کی پرندے، پھول، تالاب، عبدالرشید کی نیند موت اور بارش کے لئے، مظفر علی سید کی تنقید کی آزادی، افتخار نسیم کی زمان، حمید نسیم کی پانچ شاعر، ساقی فاروقی کی ہدایات نامہ شاعر، مختار مسعود کی لوح ایام، کشور ناہید کی ایک بری عورت کی کتھا اور مشفق خواجہ کی خانہ بگوش کے قلم سے کے علاوہ بھی دوسری کتابیں شامل ہیں۔ کم و بیش یہ اڑتالیس مضامین ہیں اور یہ تحریر تنقید نگار کی کڑی نگاہ اور کڑی گرفت کی غماز ہیں یہ مضامین عملی تنقید کی مثال ہیں۔ مرے صد و سال سے معلوم ہوتا ہے کہ جاوید شاہین نہایت بے کیف زندگی بسر کرتے ہیں، ادبی سطح پر بھی ان کا کوئی پروفائل نہیں جو قاری کے لئے دلچسپی کا حامل ہو۔

معاصر ادب کے بیشتر مضامین انیس ناگی کے رسالے "دانشور" میں اولین اشاعت کا شرف حاصل کر چکے ہیں۔

سعادت حسن منٹو...... معمار افسانہ نگار:

یہ کتاب جمالیات لاہور نے 1999 میں شائع کی۔ بقول مصنف

"معمار افسانہ نگار، سعادت حسن منٹو" کی حیات اور فن پر ایک مستقل، ہر مختصر مونو

گراف ہے۔اس تحریر کا مقصد اردو ادب کے نئے قارئین کو ایک بڑے فنکار کی
زندگی کی مہمات اور ادبی کارناموں کے بارے میں معلومات فراہم کرنا ہے، اس
کتابچے میں کوشش کی گئی ہے کہ سعادت حسن منٹو کے ادبی کارناموں کو آنے والے
زمانے کے حوالے سے دیکھا جائے"۔

اس کتاب میں سعادت حسن منٹو کے خاندان، ان کی پیدائش، ادبی زندگی کی ابتداء، شادی، مختلف علاقوں میں قیام اور منٹو کے فن پر روشنی ڈالی گئی ہے، اسی طرح منٹو کے مقدمات جن کا دورانیہ 1942 سے 1953 تک پھیلا ہوا ہے ان کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

کتاب کے آخری حصے میں بابو گوپی ناتھ اور تین گولے (میراجی) کے حوالے سے دو خصے بھی شامل کئے گئے ہیں، آخری باب میں منٹو اور اس کی جنس نگاری کے حوالے سے مصنف کا تجزیہ شامل ہے۔

سعادت حسن منٹو کی کہانی:

یہ کتاب جمالیات نے 2005 میں شائع کی ہے۔فہرست میں مقدماتی افسانوں کے انتخاب سے بیشتر درج ذیل مضامین شامل ہیں۔

1۔	سعادت حسن منٹو کی بازیافت	2۔	منٹو کے سوانح نگار
3۔	افسانہ مجھے لکھتا ہے	4۔	ایک غیر مکمل سوانح
5۔	منٹو اور مارکسزم	6۔	نیکی+بدی=منٹو
7۔	منٹو کا فن	8۔	منٹو، فسادات اور ہجرت
9۔	منٹو کی عورتیں	10۔	منٹو جنس اور فحاشی
11۔	منٹو اور نیا اردو افسانہ		

کتاب کے آخر میں منٹو کی شائع شدہ کتابوں کی تفصیل دی گئی ہے۔جو 1933 سے

1956 پر محیط ہے۔

بقول انیس ناگی

''ہم جس دور سے گذر رہے ہیں اس میں نئے ادبی اور ثقافتی ہیروز بنانے کی گنجائش نہیں رہی اور دوسری طرف ہم ماضی کے ہیروز کو بتدریج فراموش کررہے ہیں جیسے ان کا اب ہم سے کوئی علاقہ نہیں رہا۔۔۔منٹو کے فن اور نظریات کے بارے میں اس کے معاصر ادیبوں کا رویہ معاندانہ رہا ہے۔1960 کے بعد منٹو کا امیج بدلنے لگا تھا۔اب منٹو کی پچاس سالہ برسی کے موقع پر ریڈیو اور ٹیلی ویژن اسٹیشنوں پر منٹو کے افسانوں کی ڈرامائی تشکیل کی جارہی ہے۔حکومت نے بھی منٹو کا یادگاری ٹکٹ جاری کیا ہے منٹو کے بارے میں جو علمی وادبی ہچکچاہٹ تھی وہ بھی دور ہوگئی ہے۔یہ تغیر سوچ کی دیتا ہے۔منٹو اپنے عہد کا اینٹی ہیرو تھا اور آج کے عہد کا ہیرو ہے۔''

یہ کتاب منٹو شناسی کے حوالے سے ایک اہم کتاب ہے خاص طور پر اس کا پہلا مضمون ''منٹو کے سوانح نگار او ایک غیر مکمل سوانح'' بہت دلچسپ تجزیہ ہے۔

تشکیلات:

یہ مجموعہ 2006 میں جمالیات لاہور نے شائع کیا ہے۔اور اس میں پچاس مضامین شامل ہیں۔ان میں سے تقریباً دس مضامین انیس ناگی کے تنقیدی مجموعے ''مشاہدات'' میں بھی شامل تھے،لیکن ان کے دیباچہ نگار زاہد مسعود نے لکھا ہے۔

''اس کتاب کی ترتیب میں بعض مضامین میں ترمیم بھی کی گئی ہے جس کی وجہ سے ان کے نظریات میں تبدیلی ہے،نقاد کبھی منجمد نہیں ہوتا،اسے اپنے رویے میں وقت کے ساتھ ترمیم بھی کرنی چاہیے کیونکہ مطالعے کے ساتھ ساتھ نقاد کے ذہنی افق پر نئی حقیقتیں آشکار ہوتی رہتی ہیں۔''

انیس ناگی ادب اور تنقید میں ایک معروضی رویہ رکھتے ہیں ان کا تنقیدی محاذ بھی بہت کشادہ ہے ۔ادبی نظریہ سازی، ادب کا لسانی مطالعہ، عملی تنقید، نفسیات اور فلسفہ یہ سب کچھ ان کی تنقیدی تحریروں میں موجود ہے۔ بقول زاہد مسعود

"فکری اعتبار سے انیس ناگی وجودیت، ڈھلی ڈھالی مارکسیت اور جدید نفسیات کو ملا کر اپنی ادبی تھیوری مرتب کرتے ہیں جس میں وہ کلاسیکل تصورات کی مذمت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ادیب اور دانش ور کو ہر طرح کی گروہ بندی سے الگ رہنے کی ہدایت کرتے ہیں۔۔۔اردو تنقید میں معاصرین کے بارے میں لکھنے کا رواج نہیں ہے اس میں بہت سی مصلحتیں پوشیدہ ہیں، اس رجحان کے برعکس انیس ناگی نے بے شمار معاصر کتابوں پر تبصرے کئے ہیں جو اپنی تیزی اور تندی کی وجہ سے بہت سی ادبی مخالفتیں وجود میں لائے۔"

انیس ناگی اختصار و وضاحت اور نئے تنقیدی الفاظ سے اپنا تنقیدی اسلوب مرتب کرتے ہیں۔ کتاب میں شامل مضامین کی تفصیل اس طرح ہے۔

1۔ نثری نظم یا شاعری
2۔ دانش ور کون
3۔ شاعر اور آوارہ گردی
4۔ ادب اور تہذیبی جمود
5۔ اقبال سے میری ملاقات
6۔ جیلانی کامران کی تنقید کا پس منظر
7۔ نئی تنقید کی خواہش
8۔ ادیب کی سماجی ذمہ داری
9۔ پال گوگاں کا سفر نامہ
10۔ لوئی بورخیس کا انتقال
11۔ ادیب کی شناخت
12۔ فیض احمد فیض
13۔ میراجی ایک بھٹکا ہوا شاعر
14۔ محمد حسن عسکری ایک تعزیت نامہ
15۔ انور سجاد کے نام
16۔ حقیقت نگاری اور نئی حقیقت نگاری
17۔ سینٹ جان پرس
18۔ امراؤ جان ادا

19- قراۃ العین اور قراۃ العین

20- غالب

21- ساختیات کے بارے میں

22- معنی اور علم المعانی

23- داغ دہلوی

24- راشد کا آخری شعری مجموعہ

25- اردو میں تلفظ کا مسئلہ

26- آزاد نظم سے نثری نظم تک

27- ولی دکنی کے ساتھ چند لمحے

28- نئے قاری کی تلاش

29- 1960 کی نئے ادب کی تحریک اور جدیدیت

30- مصنف کی موت

31- اردو غزل ایک نئے تناظر میں

32- اقبال کی غزل

33- پاکستانی مصوری

34- نیا اردو افسانہ منظر پس منظر

35- جیلانی کامران

36- جیمز جوائس افتخار جالب اور لسانی تشکیلات

37- اشفاق احمد کی کہانی

38- ناصر کاظمی کی شاعری

39- ژاک دریدا کی موت پر

40- مسئلہ دو زبانوں کا

41- ترجمے کا فن

42- پابلو نرودا

43- ادیب کی صورت حال اور روایت

44- وجودیت کی الف، ب

45- ساختیات اور تنقید

46- قصہ جدائی کا

47- مثنوی کی بازیافت

48- وجودی نفسیات اور ادب

49- تنقید اور ادبی تھیوری

50- منیر نیازی کی شاعری

51- سارتر اور مزاحمتی ادب

بقول انیس ناگی

"اگر پاکستانی ادیب دنیا کے ادب میں اپنی شناخت چاہتا ہے تو اسے اپنی تحریروں میں پاکستانی معاشرے کا رنگ و لہو شامل کرنا ہوگا، اپنی تخلیقات میں ازمنہ رفتہ کے تہذیبی شکوہ پر اصرار کرنے کی بجائے مستقبل کے عظیم پاکستانی معاشرے کی فکری

اساس مہیا کرنی ہوگی یہ تب ہی ممکن ہے جب پاکستانی ادبی قلمی سطح پر غربت اور جہالت کے خلاف جہاد کرے اور پاکستانیوں کو اعلیٰ زندگی کا تصور فراہم کرے، ابھی تک پاکستانی ادیب کسی تہذیبی شناخت کا حامل نہیں، تہذیبی شناخت کے لئے اصرار ایک نئی ذمہ داری کا اعلان ہے۔" (ص79)

میرا جی ایک بھٹکا ہوا شاعر:

یہ مختصر کتاب بھی جمالیات نے 2005 میں شائع کی ہے۔ بقول انیس ناگی میراجی کی شخصیت پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن ان کی شاعری پر توجہ نہیں کی گئی، حالانکہ وہ ایک معمار رجحان ساز شاعر تھے۔ مصنف نے اس میں کچھ سوال اٹھائے ہیں جو میراجی کے غیر معمولی حلیے اور مبہم شاعری سے متعلق ہیں اور اس بات کا تجزیہ کیا گیا ہے کہ کیا میراجی خود ترحمی کا شکار تھے؟ ان کی سادیت پسندی خود اذیتی کا نتیجہ تھی۔ کتاب کا لب ولباب یہ ہے کہ میراجی اگرچہ بھٹکے ہوئے تھے لیکن انہوں نے اردو شاعری کو ایک نیا راستہ دکھایا۔

افتخار جالب:

یہ کتاب جمالیات نے بطور نئے ادب کا معمار مونوگراف نمبر 2 کی حیثیت سے شائع کیا ہے۔

فہرست مضامین کچھ اس طرح ہے۔

1۔ ایک جہادی کے نئے نظم
2۔ افتخار جالب کی رحلت
3۔ جیمز جوائس، افتخار جالب اور لسانی تشکیلات
4۔ افتخار جالب کی شاعری
5۔ افتخار جالب کے تنقیدی نظریات
6۔ شاعری میں لسانی تجربات
7۔ افتخار جالب کی چند تحریریں

اس مختصر سی کتاب کو لسانی تشکیلات اور نئی شاعری کے اولین پیشواؤں میں سے ایک "افتخار جالب" پر ایک ریفرنس بک کے طور پر پڑھا جا سکتا ہے اور اس سے استفادہ کیا جا سکتا ہے،

انیس ناگی نے انہیں ہدیہ عقیدت پیش کرتے لکھا ہے۔

"افتخار جالب کی تخلیقی شخصیت میں دو رویے متصادم ہیں اور غالباً اس تصادم کی بنا پر اس کی شعری اور ادبی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ افتخار جالب بنیادی طور پر نظریہ ساز ادیب ہے اس کی شاعری بھی اس نظریہ سازی کا نتیجہ ہے، اس کی نظمیں ایک باقاعدہ فکریاتی تنظیم اور پلان کے تحت لکھی گئی ہیں۔۔۔"لسانی تشکیلات" میں وہ محاکے اور مفروضے کی شاعری کے انسداد کا خواہاں ہے مگر "ماخذ" کے دیباچے میں اس کی حمایت کا خواہاں ہے، افتخار جالب کی شاعری پر ابہام کا الزام غالباً اس کے انتقادی نظریات میں عدم وضاحت کا نتیجہ ہے۔"

اس مختصر کتاب کا سنِ اشاعت 2006 ہے۔

نئے افسانے کی کھانی:

یہ کتاب جمالیات نے 2008 میں شائع کی ہے، کتاب کی فہرست دو حصوں میں منقسم ہے۔

پہلے حصے میں سات مضامین شامل ہیں۔

1۔	افسانہ ایک نئی تشکیل	2۔	نیا اردو افسانہ، منظر پس منظر
3۔	نئے افسانے کی تنقید	4۔	نیا مغربی افسانہ
5۔	افسانہ، اینٹی افسانہ	6۔	حقیقت نگاری اور فکشن
7۔	نئے افسانے کی تلاش		

دوسرے حصے میں سات افسانچے شامل ہیں۔

1۔	ایک افسانے کی تیاری	2۔	امین جگنو
3۔	سفرنامہ	4۔	تمثیل نمبر 3

5۔ چاندرات 6۔ پروین کی کہانی

7۔ ایک لمبی دوڑ

بقول تنقید نگار انیس ناگی

''ہر کتاب کو اپنا جواز فراہم کرنا چاہیے کہ اسے کیوں کر لکھا گیا ہے، کتاب محض ذات کا اظہار نہیں ہوتی اس کے عقب میں ادبی اور کلچرل محرکات ہوتے ہیں جن کی وضاحت ضروری ہوتی ہے۔''

متذکرہ کتاب میں کچھ مضامین وہ ہیں جو مصنف نے 70ء کی دہائی میں نئے اردو افسانے کی ضرورت اور اس کی تشکیل کے بارے میں لکھے، یہ مضامین پروموشنل تھے چنانچہ اس کتاب میں انہی مضامین کے کچھ نظریات میں ترامیم کر کے نئے افسانے کی فارمولیشن کی گئی ہے۔

''انیس ناگی کا خیال ہے کہ نئے افسانے کی تلاش میں نئی کہانی کی تلاش ضروری ہے ،نئی کہانی زندگی کے موجود سٹرکچر کے درمیانی لاحقوں کی تشخیص کے ذریعے جنم لیتی ہے۔ وہ افسانہ نگار جو اپنے عہد کی تجربیت سے گریز کرتا ہے وہ اپنے آپ اور اپنے شعور سے خائف ہے''۔(ص71)

انیس ناگی کی تنقیدی جہتیں

انیس ناگی ادبی حلقوں میں اپنی تنقید اور تنازعے کے باعث ہمیشہ موضوع بحث رہے، نئی بات کہنا اور چونکا دینا ان کا مشغلہ ہے، ان کی تنقید کا مجموعی مزاج کیا ہے یہ موضوع اپنی جگہ کئی مباحث کا پیش خیمہ ہے۔ تاہم اردو میں ان کی شائع شدہ کتاب شعری لسانیات ہے جو علوم ہیئت و معنی پر ایک سند کی حیثیت رکھتی ہے، بقول جیلانی کامران

''ایک لحاظ سے شعری لسانیات ادبی وفکری عقائد کی کتاب ہے اس کتاب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس کے استدلالی انداز میں میٹا فزکس کو رد کیا گیا ہے اور روحانی معرفت کو زمانہ ماضی کا اثاثہ قرار دیا گیا ہے۔۔۔ یہ کتاب ایک خاص مزاج کے قارئین کے لئے واقعی بے حد اہم ہے اس کتاب کی ایک خوبی یہ ہے کہ یہ استعارے پر بحث کرتی ہے اور استعارے کو مرکزی اہمیت دیتی ہے۔''

اسی کتاب کے بارے میں سجاد باقر رضوی کا کہنا ہے۔

''شعری لسانیات، علم خطابت وعلم معانی و بیان کی کتاب نہیں، اس لئے بھی کہ اس میں استخراجی منطق سے کام نہیں لیا گیا، اس کے برعکس اس میں ''تشخیص اور تفتیش'' کا کام ہے۔''۔۔۔ اردو میں یہ کتاب اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جو شعری محاسن اور فنی کاوشوں پر جدید نقطہ نظر سے لکھی گئی۔''

استعارے کی تشکیل آگے چل کر ساختیاتی تیگ ڈنڈیوں سے ملتی ہے، معانی کی تشکیل اور مفاہیم کے پیرامیٹرز پر انیس ناگی سے زیادہ آسان زبان میں اردو کے کسی ناقد نے بحث نہیں

کی۔ مصنف، قاری، متن اور ماحول کے مباحث میں علامتیں، اشاریے کس طرح اپنی جہت تبدیل کرتے ہیں ان کے نفسیاتی اور عمرانی تغیرات میں انیس ناگی کی نظر بہت گہری ہے۔ ایک طرف تو ان کا کہنا ہے کہ جو تنقید معاشرے میں نئے خیالات کی تولید نہیں کرتی وہ تخلیقی رجحانات میں تبدیلی پیدا کرنے کی صلاحیت سے بھی آشنا ہے دوسری جانب ان کا کہنا ہے۔

جس طرح فکر انسانی میں عہد بہ عہد تغیرات ہوتے رہتے ہیں اسی طرح دانشور کا تصور بھی ترمیم ہوتا رہتا ہے۔۔۔ انسان کی مادی ضرورتوں میں سے اس کی ذہنی صورت حال، جذباتی فیصلوں اور خارجی معوقیت کو منہا نہیں کیا جا سکتا۔

انیس ناگی اپنے بہت سے اطوار میں اشتراکیت اور وجودیت کے تصورات کے حامی دکھائی دیتے ہیں، مارکسزم کو وہ انسان کی بہتری کے لئے معاشرتی، معاشی، تہذیبی اور ذہنی انتشار سے نکلنے کا واضح فکری نظام سمجھتے ہیں۔ یہیں وہ مذہب کی شدید گرفت کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس کے بطن سے پیدا ہونے والی تشکیک اور عدم یقین سے افسردہ ہو جاتی ہے۔ نذیر احمد کی ناول نگاری میں انہی احساسات کے گہرے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔

انیس ناگی نے غالبؔ اور منٹو کے ضمن میں بھی انہی موضوعات کو آگے بڑھایا ہے جو تاریخی جبریت کا شکار نظر آئے ہیں، بقول ان کے

''انسان کا معاشرتی وجود اس کے شعور کو متعین کرتا ہے۔''

غالب کی شاعری اور اداکاری منٹو کی زندگی کی تکالیف کا بغور جائزہ لیا جائے تو ایسا ہی ٹکراؤ اور تصادم خود انیس ناگی کی زندگی میں دکھائی دے گا۔

انیس ناگی کی تنقید کا سب سے جاندار پہلو معاصر ادیبوں ان کے نظریات اور ان کی کتابوں پر ان کا واشگاف اظہار ہے۔ اس تنقید پر غیر جانبدارانہ یا جانبدارانہ قسم کی گھسی پٹی اصطلاحات کا استعمال انیس ناگی کی وسعتِ مطالعہ کی عادت اور گہرے تنقیدی معیارات کے لئے موزوں نہیں ہے۔ وہ معاصر ادب کے تقابلی جائزے کے لئے مغربی ادب کو پیش نظر رکھتے ہیں، ان کا اردو

کلاسیکی مطالعہ بھی کم نہیں اس طرح وہ اپنی تنقید کی فارمولیشن کے لئے ایک ایسی میتالینگویج بنانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں جو صرف انہی کا حصہ ہے۔

ان کی تنقیدی سرحدیں روایت پرستی سے ٹکرا کر جدیدیت کے مرکزے میں داخل ہوتی ہیں۔ انحراف اور قبولیت کے اس دائرے میں انہوں نے اپنے لئے تنقید کی جو نظریہ سازی کی ہے وہ عملی تنقید کی ایک بہترین مثال ہے۔

انیس ناگی وجودی نظریات وافکار سے بہت متاثر ہیں۔ان کا جمالیاتی اور تہذیبی شعور عصری سطح پر پوری دنیا کے ادب سے استفادے کے بعد پاکستانی ادب کا احاطہ کرتا ہے تو وہ ایک پریشانی میں مبتلا ہوتے ہیں یہ پریشانی انیس ناگی کا وہ منظرنامہ ہے جو ان کی زندگی، علم، مطالعے، تجربے اور تحقیق کے کینوس پر پھسلتا چلا جاتا ہے۔اسی پریشانی سے مذہب، ثقافت، تعلقات، نظریات اور انسانی تضادات کے رشتے جڑے ہیں ۔ یہی پریشانی سماجی تعلقات کا شاخسانہ ہے اس کی موجودگی میں انہیں ادب لغو اور زندگی بے مزہ لگنے لگتی ہے۔

نئی شاعری کی تحریک کے زیر اثر جو تنقید کی گئی انیس ناگی نے اس کا دائرہ نئے ادب تک پھیلایا ہے۔ یہ تنقید نہ تو صحافیانہ ہے نہ عامیانہ، البتہ کبھی کبھار اسی تنقید کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انیس ناگی اپنے ہم عصر لکھنے والوں کو چٹکیاں کاٹنے کے عمل سے گذرتے ہیں تو اس بلبلاہٹ کی صدا دور تک سنائی دیتی ہے۔ وہ نعرہ بازی سے بھی مملو نہیں، ان کا سفاکانہ انداز کئی بار روشنی کی حدوں کو چھو کر پلٹ آتا ہے لیکن جب بھی وہ طرز عمل اپنی ذات کے لئے استعمال کرتے ہیں تو تحریر پر ایک ایسا آئینہ بن جاتی ہے کہ نئے عہد کا انتشار اپنی مکمل سائیکی کے ساتھ اس آئینے میں اپنا گھر بنالیتا ہے۔

انیس ناگی نے عملی، فکری، عمرانی، وجودیاتی، نیم سیاسی پیمانوں سے اپنی تنقید نگاری کو ہفت پہلو بنایا ہے اور الفاظ کے نئے تلازمات سے معنویت کے متداول رشتوں کو تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔

گذشتہ پچاس برسوں سے ان کی دوسری تحریروں کے ساتھ ساتھ ان کی تنقید نگاری میدان عمل

میں ہے اور ہر بار انیس ناگی بڑی مہارت سے اپنے دشنہ و خنجر کا استعمال کرتے ہوئے تنقیدی محاذ پر فتح و کامرانی کے جھنڈے گاڑے چلے جاتے ہیں۔

پاکستانی اردو ادب کی تاریخ میں بھی انہوں نے یہی دوٹوک رویہ استعمال کیا ہے۔

اوّل الذکر پاکستانی اردو ادب کو ہندوستانی اردو ادب سے منفرد کیا ہے کیونکہ ان کا خیال ہے کہ ادب کا مطالعہ صرف ایک شاعر یا ادیب کا نہیں بلکہ پورے کلچر کا مطالعہ ہے۔ ثانی الذکر انہوں نے انہی لکھنے والوں کا انتخاب کیا ہے جو ان کے نزدیک رجحان ساز ادیب و شاعر ہیں اس تاریخ کا لب ولہجہ فکشن کا لب ولہجہ ہے چنانچہ معاشرتی، ادبی اور سماجی رجحانات کا جائزہ لیتے ہوئے ضرورت سے زیادہ منطقیت یا حتمیت سے پرہیز کیا گیا ہے۔ یہ تاریخ دراصل ایک خصوصی نقطہ نظر کی تاریخ ہے جس میں 1947 کے بعد 1960 کو ٹارگٹ کیا گیا ہے۔ تنقید، محقق اور مورخ کا خیال ہے کہ وہ ماضی سے زیادہ مستقبل پر نظر رکھے ہوئے ہیں یہی استدلال انیس نگاری کی تنقید نگاری کا مدلل استدلال ہے۔

تاریخ ، ثقافت اور نفسیات

لاهور جو شهر تها :

یہ تاریخی اور رومانی کتاب 1976 میں شائع ہوئی ۔ ازاں بعد 1993 میں القمر انٹر پرائزز نے اسے لاہور سے شائع کیا۔ کتاب کے سرورق پر ایک پینٹنگ موجود ہے جس میں 1847 کے اندرون شہر کا عکس پیش کیا گیا ہے۔ کتاب بائیس ابواب پر مشتمل ہے ۔جن میں لاہور کی سرگذشت، لاہور کے تیرہ دروازوں کی کہانی ، لاہور کی عہد بہ عہد تاریخ ، انارکلی رومان یا حقیقت، نور جہاں، جہانگیر، دارالشکوہ، مادھولال حسین، داتا گنج بخش، لاہور کا رنجیت سنگھ، جنرل ونتورا، جنرل آلار، ڈاکوماں سفرنامہ لاہور 1857 ، دفتر لاٹ صاحب، دنیا کی عظیم مسجد، لاہور کا قدیم اور جدید طرز تعمیر، لاہور کی ثقافتی ادبی اور تہذیبی سرگرمیاں، لاہور کے کتب خانے، ڈاکٹر محمد اقبال، سعادت حسن منٹو، پاک ٹی ہاؤس اور لاہور جو شہر تھا جیسے دلچسپ مضامین شامل کئے گئے ہیں۔ مصنف نے کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے۔

"ہر شہر کا دریافت کیا جانا ضروری ہے شخصی حوالے سے تاریخی حوالے سے شہر بظاہر خاموش ہوتے ہیں لیکن ان کے دیوار و در اور آسمان علامتوں کی طرح پیہم نذ بحث رہتے ہیں، ان کی بات سننا ضروری ہے، یہ بیک وقت تین زمانوں کی کہانی بیان کرتے ہیں ، یہ تین زمانے تاریخ کی تشکیل کرتے ہیں انسان اور شہر تاریخ کے اندر ہوتے ہیں" ۔

آخری مضمون "لاہور جو شہر تھا" کا اختتام کچھ اس طرح ہے۔

"لاہوریوں کے لئے لاہور ایک نشہ ہے جس سے باہر وہ نکلنا نہیں چاہتے ۔

رومانی مزاج کے لاہوریوں کے لئے اب اس شہر میں اداسی ہے، اجنبیت ہے اور حسن کی کمی ہے، ان کی رائے میں لاہور کی معاصر تہذیب بے وضع ہو چکی ہے، یہ ہر نئی بات کو، فیشن یا چیز کو بلا سوچے سمجھے قبول کر لیتی ہے، اسے اپنے نئے خدوخال وضع کرنے ہیں لیکن اس بارے میں کسی کو فرصت نہیں ہے"۔

یہ کتاب انیس ناگی کی ایک اہم کتاب ہے جو نہ صرف مصنف کے گہرے تاریخی شعور پر روشنی ڈالتی ہے بلکہ مصنف کی دوسری تحریروں کو سمجھنے کے لئے ایک پس منظر کا کام دیتی ہے، انیس ناگی ادب کے ساتھ ساتھ تاریخ کے بھی طالب علم رہے ہیں اس کتاب میں لاہور کی صدیوں پر محیط تاریخ اور خاص شخصیات کا احاطہ کیا گیا ہے اس کا مطالعہ فکری تناظر میں وسعت پیدا کرتا ہے، پیرائیہ اظہار آسان، رواں اور دلچسپ ہے۔

پاکستانی اردو ادب کی تاریخ :

یہ کتاب جمالیات نے 2004ء میں شائع کی، کتاب کو مختلف عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے اور پھر ان عنوانات کے تحت معروف لکھنے والوں کی جمع بندی کی گئی ہے۔

1۔ تنقید :۔

ڈاکٹر سید عبداللہ، محمد حسن عسکری، جمیل جالبی، ممتاز حسین، ممتاز شریں، ریاض احمد، سلیم احمد، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر وزیر آغا، مظفر علی سید، محمد صفدر میر، جیلانی کامران، فتح محمد ملک، افتخار جالب، تبسم کاشمیری، سہیل احمد خان، قمر جمیل۔

2۔ شاعری :۔

1947ء کے بعد حفیظ جالندھری، جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، ن م راشد، احسان دانش، مجید امجد، احمد ندیم قاسمی، مختار صدیقی، انجم رومانی، قیوم نظر، ظہیر کاشمیری، یوسف ظفر، ظہور نظر، جمیل

الدین عالی، عزیز حامد مدنی، ضیا جالندھری، محمد صفدر میر، وزیر آغا، ناصر کاظمی، ظفر اقبال، اختر حسین جعفری، منیر نیازی، شہرت بخاری، احمد فراز، شکیب جلالی، اختر احسن، جون ایلیا، محمد سلیم الرحمان، شہزاد احمد، احمد مشتاق، جاوید شاہین، سلیم شاہد، آفتاب اقبال شمیم، ساقی فاروقی، جیلانی کامران، افتخار جالب، عباس اطہر، زاہد ڈار، تبسم کاشمیری، عبدالرشید، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، سرمد صہبائی، پروین شاکر، سہیل احمد خان، امجد اسلام امجد، سعادت سعید، محمد اظہار الحق، غلام حسین ساجد، افضال احمد سید، علی اکبر عباس، یاسمین حمید، ابرار احمد، حسین مجروح، شاہین مفتی، زاہد مسعود، سلیم شہزاد۔

3۔ افسانہ :۔

سعادت حسن منٹو، ممتاز مفتی، غلام عباس، قدرت اللہ شہاب، شوکت صدیقی، آغا بابر، احمد ندیم قاسمی، خدیجہ مستور، انتظار حسین، اشفاق احمد، اے حمید، بانو قدسیہ، انور سجاد، اسد محمد خان، مسیح آہوجہ، احمد ہمیش، مظہر الاسلام، منشا یاد، خالدہ حسین، رشید امجد، زاہدہ حنا، یونس جاوید، محمد سعید شیخ۔

4۔ ناول :۔

ممتاز مفتی، شوکت صدیقی، خدیجہ مستور، انتظار حسین، اے حمید، جمیلہ ہاشمی، عبداللہ حسین، انور سجاد، مستنصر حسین تارڑ۔

5۔ دیگر اصناف :۔

(ڈرامہ، مضمون نویسی، خاکہ نگاری، مزاحیہ ادب)

6. خود نوشت :۔

شہاب نامہ، مٹی کا دیا، اپنا گریباں چاک، خدوخال، کھوئے ہوؤں کی جستجو، یادوں کی برات، دل بھٹکے گا، ایک بری عورت کی کتھا۔

7۔ **تحقیق :۔**

ڈاکٹر سید عبداللہ، جمیل جالبی، ڈاکٹر وحید قریشی، مشفق خواجہ، تبسم کاشمیری۔

8۔ **تراجم :۔**

اردو تراجم 1947ء کے بعد 272 صفحے کی اس کتاب کے دیباچے میں مصنف نے لکھا ہے۔

''پاکستانی ادب کی تاریخ'' کو پہلے لکھا جانا چاہیے تھا لیکن پاکستان کے بیشتر ادیب بھارت میں اپنے آپ کو تسلیم کروانے میں اتنے مشتاق رہے ہیں کہ انہیں احساس نہیں ہوا کہ بہت کچھ بدل چکا ہے۔ پاکستانی ادب کی ایک منفرد روایت وجود میں آ چکی ہے۔

اگر پاکستان اور ہندوستان کی معاشرت اور سیاسی تاریخ کا تقابل کیا جائے تو دونوں غایت درجہ مختلف رہی ہیں اور اب بھی ہیں، پاکستان کی سیاسی اور اقتصادی بدحالی اور مذہبی تعصبات نے یہاں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بے حسی، خوف اور بے اعتمادی پیدا کی ہے۔ ہندوستان کی نسبت پاکستانی معاشرہ ایک بند معاشرہ ہے جہاں مذہبی گھٹن، جنسی گھٹن، برداشت کی کمی، عدم رواداری اور ہر طرح کی ذمہ داری قبول کرنے سے گریز، تمام اداروں کا انہدام، غایت درجہ جہالت، غربت، جاگیرداری نظام کا زور، فوجی اور سیاسی حکومتوں میں سرکشی کے باعث انفرادی اور اجتماعی سائیکی ایک عجیب و غریب علالت کا شکار رہی ہے، ان مسائل نے پاکستان میں نئے ادب کی ضرورت پر اصرار کیا۔ ادبی تاریخ کے بارے میں عام تصور ہے کہ اس میں زیادہ سے زیادہ ادیبوں کا ذکر ہونا چاہیے۔ اس میں بھی ترمیم کی ضرورت ہے کیونکہ ادبی تاریخ میں صرف وہی جگہ پاتے ہیں جو رجحان ساز ہوں یا ان کے انفرادی محاسن ان کی موجودگی کا جواز فراہم کرتے ہوں۔ اس ادبی تاریخ میں اسی تصور کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔

اگر تاریخ نگار 1940ء کی شاعری اور ادب کے دائرے کو ذرا سا وسیع کرتے تو اس تاریخ میں زیادہ وسعت پیدا ہو سکتی تھی اور پاکستانیت کے شواہد کو مزید سنبھالا دیا جا سکتا تھا۔

عمومی نفسیات :

یہ کتاب اردو سائنس بورڈ لاہور نے 1995ء میں شائع کی اس کتاب میں ۱۲ مضامین شامل ہیں جن کی فہرست کچھ اس طرح ہے۔

نفسیات کیوں، ہجوم کی نفسیات، زندگی میں معنی، جنس اور معاشرہ، ذات پات کی نفسیات، بے خوابی کی دنیا، بیگانگی، کچھ وجودیت کے بارے میں، افواہوں کی نفسیات، گالیوں کی نفسیات اور نفسیات اور ادب۔

اس کتاب کے پیش لفظ میں ظفر اقبال نے لکھا ہے۔

''عہد حاضر نے جہاں انسان کو بے پناہ آسانیاں عطا کی ہیں۔ وہاں مختلف قسم کے مسائل سے بھی دو چار کر دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ تمام تر آسائشوں کے باوجود انسان ذہنی طور پر آسودگی سے قطعی محروم ہے، چنانچہ نفسیات اور جدید ترین نفسیات کا مطالعہ ہر باشعور قاری کے لئے ضروری ہے''۔

اس کتاب میں وجودی اصطلاحات اضطراب، بےگانگی اور بے خوابی کو عمومی معاملات کے طور پر آسان زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ بقول مصنف

''نفسیات فرد کے ارادے کا مطالعہ کرتی ہے اور تجربے کو نفسیات کا بنیادی موضوع ہونا چاہیے، فرد کا تجربہ داخلی ہوتا ہے جس تک مظہریات کے نئے اسلوب سے رسائی حاصل کی جا سکتی ہے''۔

جنس اور وجود :

اس کتاب کے عنوان میں دو کلیدی الفاظ جنس اور وجود، مرد و زن کی ثنویت ظاہر کرتے ہیں، نفسیات کی تحلیل کے ضمن میں فرائیڈ، یونگ اور ایڈلر کے حوالے دیے گئے ہیں۔ Gender کے انفرادی اور معاشرتی تفاوت کی جبریت کو ظاہر کرنے کے لئے عمومی مثالیں بھی

شامل کی گئی ہیں۔

لفظ ''وجود'' کی وضاحت کے لئے مصنف نے لکھا ہے۔ ''وجود زمان ومکاں میں اپنی موجودگی یا ہونے کا احساس ہے کہ میرا وجود ان تمام سے الگ ہے، اگر میں نہیں تو میرے لئے کچھ نہیں ہے اس احساس کو شعور کا نام دیا جاتا ہے، وجود کو دوسروں کے ذریعے محسوس کیا جاتا ہے، دوسرے ایک مخالف دُنیا ہے، فرد عمر بھر ایک مخالف Hostile دنیا میں رہتا ہے۔ وجود کو خواہشوں کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے جو اس کے ارادے کی وضاحت کرتی ہیں۔''

اس کتاب کے ذریعے مصنف نے عورت کی مختلف حیثیات کا بھی جائزہ لیا ہے، مصنف نے لکھا ہے۔

''جنوب ایشیاء کے ممالک میں خاص طور پر پاکستان میں انسانی رشتوں کی بنیاد ایک دوسرے کی تعظیم کی بجائے خوف ہے، ہمارے معاشرے میں مرد اور عورت کا تعلق چوری چھپے کا ہے جو اپنے ساتھ ایک احساسِ جرم لئے ہوتا ہے۔۔۔۔اجتماعی سطح پر خوف پیدا کرنے والے عناصر کو ایک بہتر نظام ختم کرسکتا ہے۔''

کتاب کا دیباچہ ڈاکٹر انور سجاد کا تحریر کردہ ہے۔ اس کتاب کے موضوعات کی تفصیل اس طرح ہے۔ پاکستانی عورت کی صورتِ حال، پاکستانی مردوں کے جنسی رویے، شادی، خانہ آبادی/خانہ بربادی، عیٖجورگی کی زندگی، خواہش، خواب اور رات، طوائف کی اندھی گلی، آبادی کا ایٹم بم، خوف کی دنیا۔ اس کتاب کے توسط سے ہم مصنف کے فیمینسٹ نظریات سے آگاہی حاصل کرسکتے ہیں۔ 2008 کے دانشور کے شمارے میں انہی خیالات کا اعادہ ''نسائیت اور ادب'' کے مضمون میں ملتا ہے۔

کالم نگاری، ادارت اور انتخاب

کالم نگاری :

اردو ادب کی دوسری اصناف کے ساتھ ساتھ انیس ناگی کے انگریزی اور اردو کالم بھی کافی مقبول ہوئے، جن کا آغاز انگریزی روزنامہ "پاکستان ٹائمز" سے کیا گیا تھا۔

1990 سے 1991 تک انیس ناگی کے ہفتہ وار کالم Literature and Culture کے نام سے انگریزی روزنامہ "Nation" میں شائع ہوئے۔ 1993 سے 1994 تک انہوں نے "Frontier Post" کے لئے ہفتہ وار ادبی کالم لکھے۔

2001 سے 2002 تک وہ "Indipendent Weekly" کے لئے ادبی کالم لکھتے رہے۔

2004 میں انہوں نے اردو روزنامہ "جنگ" کے لئے "بک سٹریٹ" کے نام سے ادبی کالموں کا سلسلہ شروع کیا جو جمعہ کے ادبی صفحہ پر شائع ہوتا رہا۔

2008 میں انہوں نے انگریزی اخبار "The News" کے لئے مہینے میں تین کالم لکھنے کا معاہدہ کیا۔ یہ کالم ابھی تک "Dr Anis Nagi Column" کے نام سے شائع ہوتا ہے۔

انیس ناگی کالم نگاری میں بھی اپنا ایک خاص ڈھنگ رکھتے ہیں، نمونے کے طور پر ایک کالم شامل کتاب ہے۔

Daily "The News"

Candidrecollection

Saqi Farooqi's autobiography falls short of becoming a crafty tale

ByAnisNagi

Should one write an autobiography or scribble memoirs at the tail end of one's to provide a raison de etre? Or and inner impulsion for self expression leads to many such private writings? In the past such such writing were tiltled apologia perhaps to unload the burden of an uneasy conscience. The confessions of St. Augustine and those of Roussenu are known for the frankness and exposure of darkness of the human mind. Frankness or truth are not a literary merit of an autobiagraphy. The truth has to be cast in a mould that gives a new vision to life. In this regard, Jean Paul Sarter's words provide a remarkable self analysis.

Autobiagraphy or memoir has no proven format to be followed, it is innovated by the author, his caprice can take him to any genre which pleases his, epistle wirting, memoirs, novels, diary writing all are available options.

But a line has to be drawn between an autobiagraphy and memoir. The former includes life of the author and is period in a chronological order, whereas the latter is focused on the writers own self and very often guided by

stream of consciouness. In both cases, one has to write one's own self without any inhibitions and taboos.

Saqi Farooqi defies all norms and builds up his own cobweb where all events, facts and personages are mixed up without any sequence. The title is a bit shocking: Aap Beeti Pap Beeti for readers who is not prepared to listen to the dark side of the author. A few years back Ashfaq Naqvi's autobiagraphy Paap Beeti shocked many for his candour in respect of his affairs.

Aap Beeti Paap Beeti is not a well designed book which could build up a sequence of authors life, ill assorted events overlap each other. He was born in Gorakhpur, India in a lower middle class family and was educated in the local schools. After 1947, he along with his family, migrated to Pakistan and settled in East Pakistan where his father had some business. After his marticulation, the family settled in Karachi where Saqi completed his college education and wrote poetry while drafting scripts for Radio Pakistan Karachi. In his literary journey, he became friends with writers of Karachi. Saqi has devoted a considerable portion of his book to these friends.

All the leading literary journals published his poetry but those who witnessed that literary era might not subscribe to this hyperbolic assertion of Saqi Farooqi. He started writing Ghazal in a conventional manner adn subsequently switched over to nazam. His collected poems Maindick Nama contains some good poems. Even in his poetry he is

satirical and at time whimsical. He lagged behind the literary climate of the early 60s which clamoured for change in the literary norms and particularly the hegemony of classicsm which restricted the writters to remain within the accepted limits of literature. The New Wave poetry recieved very histile criticism but soon gained ground. Saqi Farooqi's literary position remained subdued. He did not write much of prose except sundry essays.

The book, however, is not without its flaws. A crafty autobiographer should know the knack of dramatising and evoking interest of the reader. His narration should not be so personalised as to eliminate the socip-political ambiance of his period. Saqi Farooqi can be excused of this lapse because he is prone to write his memorals than a well balances autobiagraphy.

Last three chapters of the book are quite absorbing with a detailed account of private life of celebrated poet. N.M Rashid who settled in London after his retirement from the United Nations. Saqi Farooqi was quite close to him. He has access to his private life. He tells us that the italian wife ot the poet was unaware of the creative life of her illustrious hisband. N.M Rashid was scious of his litcrary and social status. A considerable space has been given to Faiz Ahmed Faiz. Farooqi was a devotee of the legendary poet and laments his death. Lastly, the narrative would have been more absorbing if the author has avoided unnecessary poetry.

دانشور :

1987 سے انیس ناگی نے ایک مختصر رسالہ "دانش ور" شائع کرنے کی ابتدا کی ۔ وہ اس رسالے کی اشاعت کے سلسلے میں ہمیشہ سنجیدہ رہے،اس رسالے پر زیادہ تر جدید عالمی ادب کے تراجم اور نثری نظمیں شائع کی جاتی ہیں یہ تحریریں مصنف کی خاص نقطہ نظر کو آگے بڑھانے میں مددگار ثابت ہوئی ہیں ۔ دانش ور نے کئی ادیبوں اور شاعروں کے خاص نمبر بھی شائع کئے ہیں جن میں سارتر، کامیو، اکتاوپاز، محمود درویش، جیلانی کامران، منیر نیازی اور افتخار جالب نمبر بہت مقبول ہوئے ۔

دانش ور ایک ٹیم ورک ہے اور اس رسالے کا ایک حصہ ادیبوں کی کتابوں پر اظہار خیال کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے ان تبصروں کی بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے بہت سے ادیبوں کو انیس ناگی سے ناراضگی کے مواقع فراہم کئے ہیں ۔ یہاں 1993 کے دانش ور سے انتظار حسین کے افسانوی مجموعے "خالی پنجرہ" کے بارے میں انیس ناگی کے قلمی نام غازی علم دین کا ایک تبصرہ نقل کیا جاتا ہے۔

> "انتظار حسین گفتگو میں روشن دماغ ہیں ، اپنے کالموں میں بھی کبھی کبھی وہ بصارت کا اظہار کرتے ہیں لیکن اپنے افسانوں میں ڈپٹی نذیر احمد بن جاتے ہیں کہ دنیا کا چہرہ بے شک بدل جائے پر میں نہ مانوں ۔ انتظار حسین نے اپنی زندگی کا کافی عرصہ لاہور کے ایک فیشن ایبل علاقے میں بسر کیا ہے ۔ وہ کاروں میں سفر کرتے ہیں، ٹیلی ویژن کے لئے کھیل لکھتے ہیں، انہوں نے یورپ اور امریکہ کا سفر بھی کیا ہے وہ اس سہولت تجربے اور کشادگی کے باوجود ہمیشہ ذہنی طور پر پرانے علاقے کی بیل گاڑی اور کبڑے شہتروں کے چھوٹے چھوٹے گھروں، پنواڑیوں، پیشہ کاروں اور ان لوگوں میں خوش رہتے ہیں جو اس زمانے میں بھی

زندگی میں تبدیلی سے ناخوش تھے کہ لڑکیوں نے چوٹیا کی بجائے جوڑے بنانے شروع کر دیئے ہیں۔ انتظار حسین کے یہ سب کردار پاکستان آکر ضعیف ہو گئے ہیں اور اب وہ تبدیلی کے عمل پر ناراض ہیں۔۔۔ انتظار حسین کو اپنے افسانوں میں تازگی کے لئے ایسے موضوعات کو تلاش کرنا ہوگا جو معاصر زندگی کو بسر کرنے کا حوصلہ پیدا کر سکیں۔'' (ص 96-95)

دوست دشمن انیس ناگی سے ہزار اختلاف کے باوجود دانش ور کے منتظر رہتے ہیں اور پھر ہفتوں دانش ور کی تبصرہ آرائی موضوع گفتگو رہتی ہے۔

دانش ور اپنے اختصار کے باوجود فکری اعتبار سے ایک زندہ رسالہ ہے۔

ادبی و شعری انتخاب :

انیس ناگی نے نئی شاعری کے عنوان کے تحت سرودِ نو سے استانزے تک پہلے ایک تحقیقی مقالہ لکھا ازاں بعد فیض، راشد، مجید امجد کی شاعری سے لے کر 1960 کے نئی نظم۔ کے شاعروں کو اپنے انتخاب میں جمع کیا۔ اسی طرح اپنے دیباچے کے ساتھ میرا جی کی نظموں کا انتخاب شائع کیا۔ سعادت حسن منٹو ایک مطالعہ کے زیر اہتمام پچیس مضامین اکٹھے کئے جنھیں مقبول اکیڈمی نے شائع کیا۔

''سجرے پھل'' پنجابی نظم کا انتخاب ہے جسے ازاں بعد پنجابی نصاب میں شامل کیا گیا ہے۔

حسابِ دوستاں

سجاد باقر رضوی :

''شعری لسانیات اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔لفظوں کی زندگی اور ان کی صحت، نیز استعاروں کی تخلیقی ضرورت پر ایک پوری کتاب تحریر کرنے کے لئے جس بصیرت کی ضرورت تھی وہ انیس ناگی صاحب کو ملی۔''

ڈاکٹر وحید قریشی :

''لفظوں کے معروف تلازمے، دروبست کے نحوی سانچے اور لفظوں کے باہمی ارتباط کا میکانکی طریقہ بدل کر ناگی نے نثر کی روایت میں اہم لیکن دشوار قدم اٹھایا ہے۔

(ہوائیں سینٹ جان پرس، ترجمہ: انیس ناگی)

افتخار جالب :

''انیس ناگی کی اہمیت ایک اور معنوں میں ہے کہ انہوں نے ادب کی کئی جہتوں کام کیا ہے، تنقید، افسانہ، ناول، شعر، پنجابی افسانے، پنجابی شعر، ایک بہت بڑے تناظر میں انہوں نے تراجم کی دنیا میں بہت کام کیا ہے۔۔۔۔انیس ناگی کی دو تین طبعی خصوصیات بھی ہیں۔مثلاً وہ اپنے رویوں میں خالصتاً شاعر آدمی ہے، فوری پسند اور ناپسند کا اظہار کرتا ہے اس نے اپنے افسانوں میں جو مسائل اٹھائے ہیں وہ دقیق مسائل ہیں۔''

افتخار عارف :

انیس ناگی سے ہزار اختلاف رکھنے والے لوگ بھی اس بات سے اتفاق کریں گے کہ ان کی عالمی عصری ادب پر گہری نظر ہے۔ وہ صاحب مطالعہ بھی ہیں اور صاحب دل بھی۔ ادب ان کے لئے مشغلہ نہیں بلکہ ان کی زندگی ہے، انتہائی رویوں کے باوجود وہ ادب سے کُل وقتی وابستگی رکھتے ہیں ان کی تحریروں میں ایسی دردمندی ہے جو ہر صاحب دل کو ان کی طرف متوجہ کرتی ہے، ہمارے زمانے میں اور کتنے لوگ ہوں گے جنہوں نے انیس ناگی کی طرح اپنے آپ کو صرف ادب سے وابستہ کیا؟

کشور ناهید :

انیس ناگی اپنی تحریروں کی کرافٹ کے اعتبار سے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ ان کی سیماب صفتی ان کی تحریروں کی خاص پہچان ہے اور وہ عصر حاضر میں ایک دانش ور کی پہچان رکھتے ہیں۔

فخر زمان :

انیس ناگی اپنے خلوص اور ادب سے گہری کومٹ منٹ کے باعث ہمیشہ سے قابلِ احترام رہے ہیں۔ مزاحمتی ادب کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ محفوظ رہے گا اور وہ اپنی تحریروں کا آئینہ دکھا دکھا کر ہمیں استقامت اور انفرادیت کا درس دیتے رہیں گے۔

جیلانی کامران :

انیس ناگی نے اپنی کتاب ''نوحے'' کی نظموں کے ذریعے زمانے کا نیا رانجھ پیش کیا ہے۔ اس نئے منظر نامے میں نیا دن، نئے چہرے، نئی آرزوئیں ہمارا ساتھ دیتی ہیں۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ انیس ناگی نے ہمارے لئے نئے مزاج کی خبر دی ہے۔ کیا وہ مزاج ہمارے لئے محترم ہو سکے گا اور ہم نایافت کی منزلوں میں اس دوست کی ہمراہی میں جتنا سفر کریں گے وہ سفر ہماری قسمتوں کا ضامن ہوگا۔ انیس ناگی کا یہ مجموعہ نئے براعظموں کے سفر کی کہانی ہے۔

عبدالرشید :

انیس ناگی بہت جری ہے کہ اس کا شاعری پر ابھی ایمان باقی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ آج بھی شعر ایک Credible reference ہے۔ کواڑ کھولو، وہ لفظ ڈھونڈ، جو مدعا ہیں۔

سدا سہاگن مری زمیں ہے

ڈاکٹر تبسم کاشمیری:

جنم ایک آندھی کی نظمیں پڑھ کر میری ملاقات ایک ایسے شاعر سے ہوئی ہے جو نظموں میں رہتا ہے۔ میرے نزدیک اس مجموعے کی حیثیت تاریخی ہے۔ 1960 کی نئی شاعری کی تحریک کا نمائندہ شاعر 2007 میں اعلان کر رہا ہے کہ اس کا تخلیقی سفر ہنوز جاری ہے۔۔۔ جیلانی کامران اور افتخار جالب کے بعد انیس ناگی نئی شاعری کا آخری بڑا شاعر ہے۔

سلیم شہزاد :

اپنی دیگر ادبی مہمات کے مقابلے میں اگرچہ انیس ناگی نے افسانے پر دیر سے توجہ دی لیکن اس کی کوشش رہی کہ موجودہ فارمیشن توڑ کر افسانے کے تار و پود کی فارمیشن نئے عصری تقاضوں، عصری روایت اور حسیت کے مطابق کی جائے اس نے Objective لینگو ئج میں افسانہ لکھا، وجودیت کی لہر میں ڈوبے کرداروں کو ایک دوسرے سے مربوط بھی کیا اور ایک دوسرے سے توڑ کر ذو معنویت پیدا کرنے کی کوشش بھی کی۔

ڈاکٹر سلیم الرحمٰن :

313 بریگیڈ انیس ناگی کی فکشن کی نئی کتاب موضوع اور تکنیک کے اعتبار سے ایک منفرد حیثیت کی حامل ہے یہ بے حد Readable ناول ہے، واقعات، مقامات اور تاریخی پس منظر کے بیان میں مصنف نے بہت محنت کی ہے۔

انور سجاد :

میں نے "ایک ادھوری سرگذشت" کو کم سے کم تین مرتبہ پڑھا ہے اور یہ بے حد Readable کتاب ہے اس میں انیس ناگی کی نثر بہت عمدہ ہے اس میں غیر معمولی روانی ہے۔

ڈاکٹر سعادت سعید :

انیس ناگی کی سات حکایات اور تین تمثیلیں۔۔۔اس اعتبار سے ہمارے ادب میں تازہ ہوا کا جھونکا ہیں کہ ان میں مصنف نے اپنی فکری فارمولیشنز ایک کردار اس سے متعلقہ زندگی کے وقوعات کے بطن میں داخل کر کے اردو افسانے کو ایک نیا فکری ذائقہ بخشنے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر ضیاء الحسن :

انیس ناگی ادب میں حرکت اور تغیر کے قائل ہیں۔ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ زندگی میں آنے والی تبدیلیاں ادب پر اثر انداز ہوتی ہیں جس کی وجہ سے ادب بھی موضوعاتی اور فنی دونوں حوالوں سے تبدیل ہو جاتا ہے۔

زاھد مسعود :

انہوں نے نثری نظم کو ڈیزائن کے اعتبار سے آزاد نظم سے مماثل قرار دیا ہے اور اس کے لئے زبان کے تخلیقی استعمال پر زور دیا ہے ان کے نزدیک آزاد نظم اور نثری نظم اردو کی شعری روایت سے انحراف یا بغاوت نہیں یہ اردو کی شعری روایت میں نئے اسالیب کی دریافت اور اس کا فروغ ہیں۔

یاسین آفاقی:

انیس ناگی کی فکشن اور شاعری ساخت کے اعتبار سے تشکیک، مغائرت، بے یقینی، بے زاری، بدگمانی، خوف، استحصال اور بغاوت کی خواہش کے اجزاء سے ترتیب پاتی ہیں۔ ان کا جدید شعور یہ سوال کرتا ہے کہ فرد کے گرد پھیلی ہوئی زندگی کیا معنی رکھتی ہے اور کیا غیر منصفانہ نظام میں انسان اپنا آپ حاصل کرسکتا ہے۔

تنویر صاغر:

تنہائی کی اصطلاح کو انیس ناگی نے اپنی دو تنہائی نظموں میں جگہ دی ہے اور اس کا ابلاغ معنیاتی سطح پر متنوع انداز میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔

مختصر مختصر

ادبی انعامات :

انیس ناگی کی تحریروں کو گذشتہ چالیس برس سے نا صرف تحسین کی نگاہوں سے دیکھا گیا ہے بلکہ پذیرائی کے لئے انعامات سے بھی نوازا گیا ہے۔ انہوں نے 1976 میں تنقیدی مضامین کی کتاب "تصورات" پر آدم جی ادبی انعام حاصل کیا۔ 1976ء ہی میں انہیں Modern Urdu Poems from Pakistan پر نیشنل بنک آف پاکستان ادبی انعام دیا گیا۔ 1981 میں ان کے ناول "دیوار کے پیچھے" پر بولان اکیڈمی ادبی انعام دیا گیا۔ 1998 میں ان کے ناول کیمپ پر وزیر اعظم ادبی انعام دیا گیا۔

ڈاکومنٹریز:

اقبال اکیڈمی کے توسط سے انیس ناگی کے علامہ اقبال کی زندگی پر ایک دستاویزی فلم تیار کی، یہ فلم اکیڈمی کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ 1992 میں انہوں نے سعادت حسن منٹو کی زندگی پر ایک فلم تیار کی، اس فلم میں خود انیس ناگی نے اور ان کے قریبی دوستوں نے مختلف کردار ادا کئے۔

غیر ملکی سفر :

دورانِ ملازمت انیس ناگی 76-1975 میں الجزائر کے سرکاری دورے پر گئے۔ اسی دوران وہ انگلستان، روم اور تھائی لینڈ بھی گئے۔ 1983 میں انہیں چار ماہ کے لئے جاپان جانے کا موقع ملا۔ 1994 میں وہ کوریا گئے اور 2003 میں نجی مصروفیات کے باعث آئرلینڈ گئے۔

ادبی خدمات کا اعتراف:

انیس ناگی کی تحریروں نے نئی نسل کے ادیبوں کو کافی متاثر کیا۔ ان کی تحریروں میں مزاحمت، انکار اور سماج سدھار کے رویوں کے ساتھ ساتھ کامیو اور کافکا کی تجویز کردہ۔ بے دلی اور لاتعلقی ایک ایسا فیشن بن گئی جس نے ان کے قارئین کو بہت متاثر کیا۔ 1997 میں شاہین مفتی نے اردو ادب کا اینٹی ہیرو۔ انیس ناگی کے نام سے انیس ناگی کی تحریروں سے ابھرنے والے نمائندہ کردار کا جائزہ لیا، اس کتاب کو حسن پبلی کیشنز نے شائع کیا۔

1997 میں زاہد مسعود نے ایک وجودی ناول نگار کے عنوان کے تحت انیس ناگی کے ناولوں پر لکھے گئے مضامین کا ایک انتخاب شائع کیا۔ 2007 میں نئے ادب کے معمار۔۔ انیس ناگی کے نام سے ایک کتاب جمالیات نے شائع کی ہے جسے تنویر صاغر نے مرتب کیا ہے۔

گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی لاہور سے انیس ناگی کی ناول نگاری پر فاخرہ پروین نے ایک مقالہ لکھا ہے، اسی طرح سرگودھا یونی ورسٹی سے ان کے ناول دیوار کے پیچھے اور کیمپ پر مقالے تحریر کئے گئے ہیں۔ انیس ناگی کا علمی وادبی سفر ابھی جاری وساری ہے اور ان کی دانش، سے مزید جدت اور ندرت کی توقع کی جا سکتی ہے۔

حوالہ جات وکتابیات

1.میری سرگذشت

2.صورت حال کی نظم نگاری

شعری مجموعے

بشارت کی رات	1966
غیر ممنوعہ نظمیں	1974
نوحے	1976
زرد آسمان	1979
روشنیاں	1984
بے خوابی کی نظمیں	1987
آگ ہی آگ	1989
ابھی کچھ اور	1990
بے خیالی میں	1992
بیابانی کا دن	1994
صداؤں کا جہاں	1995
درخت میرے وجود کا	1997
بیگانگی کی نظمیں	2000 کلیات
جنم ایک آدمی	2007

3.انیس ناگی کی ناول نگاری

دیوار کے پیچھے	1980
میں اور وہ	1983
زوال	1989

ایک گرم موسم کی کہانی	1990
ایک لمحہ سوچ کا	1991
محاصرہ	1992
قلعہ	1994
چوہوں کی کہانی	1995
کیمپ	1998
پتلیاں	2003
ناراض عورتیں	2004
313 بریگیڈ	2007
فصلیں (مجموعہ چار ناول)	

4. انیس ناگی کی افسانہ نگاری

حکایات
گردش
وقت کی کہانیاں
بدگمانیاں
افسانے

5. خود نوشت

ایک ادھوری سرگزشت

6. نثری اور شعری تراجم

نثری تراجم

سفس کی کہانی (فلسفہ)	البیر کامیو	(فرانسیسی ادب)
طاعون (ناول)	البیر کامیو	(فرانسیسی ادب)
کایا کلپ (افسانہ)	فرانز کافکا	(فرانسیسی ادب)
تہہ خانے سے (ناول)	دوستوفیسکی	(انگریزی)

شعری تراجم

جہنم میں ایک موسم	آرتھر راں بو	(فرانسیسی ادب)

ہوائیں	سینٹ جان پرس	
جلاوطنی اور دوسری نظمیں	سینٹ جان پرس	
ٹی ایس ایلیٹ کی نظمیں	ٹی ایس ایلیٹ	(انگریزی ادب)
پابلو نرودا کی نظمیں	پابلو نرودا	(انگریزی ادب)

Poem of Iqbal

Modern urdu poems from pakistan

Ancient Lahore (Edited and Prefaced)

7.تنقید و تحقیق

تنقیدِ شعر	1966
نذیر احمد کی ناول نگاری	1967
نیا شعری افق	1969
شعری لسانیات	1969
تصورات	1976
مذاکرات	1986
غالب ایک شاعر، ایک اداکار	1990
مشاہدات	1993
غالب پریشاں	1993
غالب کا مقدمۂ پنشن	1996
میری ادبی بیاض	1996
معاصر ادب	1997
سعادت حسن منٹو) نئے ادب کے معمار)	1999
سعادت حسن منٹو کی کہانی	2005
میرا جی ایک بھٹکا ہوا شاعر	2006
افتخار جالب ایک مطالعہ	2006
نئے افسانے کی کہانی	2008
شعری لسانیات (استعارہ، علم المعانی اور شاعری کا تعلق)	1990

8.تاریخ ، ثقافت اور نفسیات

لاہور جو شہر تھا	1976
پاکستانی اردو ادب کی تاریخ	2004

عمومی نفسیات	1995
جنس اور وجود	2000

9.کالم نگاری، ادارت اور انتخاب

پاکستان ٹائمز	1989-90	انگریزی
فرنٹیئر پوسٹ	1993-94	انگریزی
نیشن	1990	انگریزی
انڈیپنڈنٹ ویکلی	2001-02	انگریزی
جنگ	2004	اردو
نیوز	2008	انگریزی

☆☆☆☆☆

رسالہ دانشور

☆☆☆☆☆

ادبی و شعری انتخاب

نئی شاعری	جمالیات، لاہور
میراجی کی نظمیں	جمالیات، لاہور
بکھرے پھل (انتخاب پنجابی نظم)	پنجابی مجلس، لاہور
سعادت حسن منٹو ایک مطالعہ	مقبول اکیڈمی، لاہور